راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly
Arzang
Lahore

مدیرِ اعلیٰ:

عامر بن علی

مدیران:

حسن عباسی

لبنیٰ صفدر

مئی ۲۰۲۶ء

CamScanner

اگر ادیب سیاست میں آئیں تو زیادہ موثر ثابت ہوں گے

سوشل میڈیا نے ادبی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے

مقبول شاعرہ، ادیبہ، کالم نویس اور سفرنامہ نگار

ڈاکٹر عمرانہ مشتاق

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،

کالم نگار اور سفرنامہ نگار **عامر بن علی** کی خصوصی گفتگو

مزاحیہ مشاعروں سے ادبی تربیت اور فکری بالیدگی حاصل نہیں ہوتی جو سنجیدہ مشاعروں کا خاصہ ہے

اگر احساس کی گہرائی فنکار میں نہیں تو اس کے مشاہدات بھی کمزور ہوں گے

احساسات اور جذبات تو ہر انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں اور ہم سب مشاہدات بھی کرتے ہیں مگر اہل قلم کے پاس یہ خصوصی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے ان کا اظہار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق ایسی ہی ایک نامور اور باکمال قادر الکلام شاعر، ادیب، افسانہ نویس و کالم نگار ہیں۔ سفرنامہ بھی دیگر اصناف سخن کی طرح سند قبولیت رکھتی ہے۔ چودہ کتابوں کی مصنفہ ہیں اور ادب کے فروغ میں ہمہ وقت مشغول رہتی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ انہوں نے ماہنامہ ارژنگ کے قارئین کے لیے مکالمے کا خصوصی وقت دیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

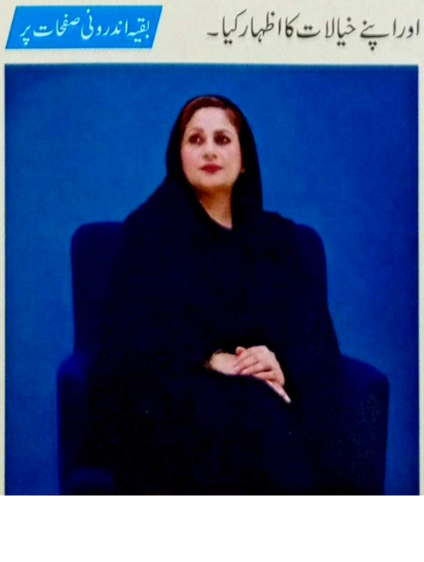

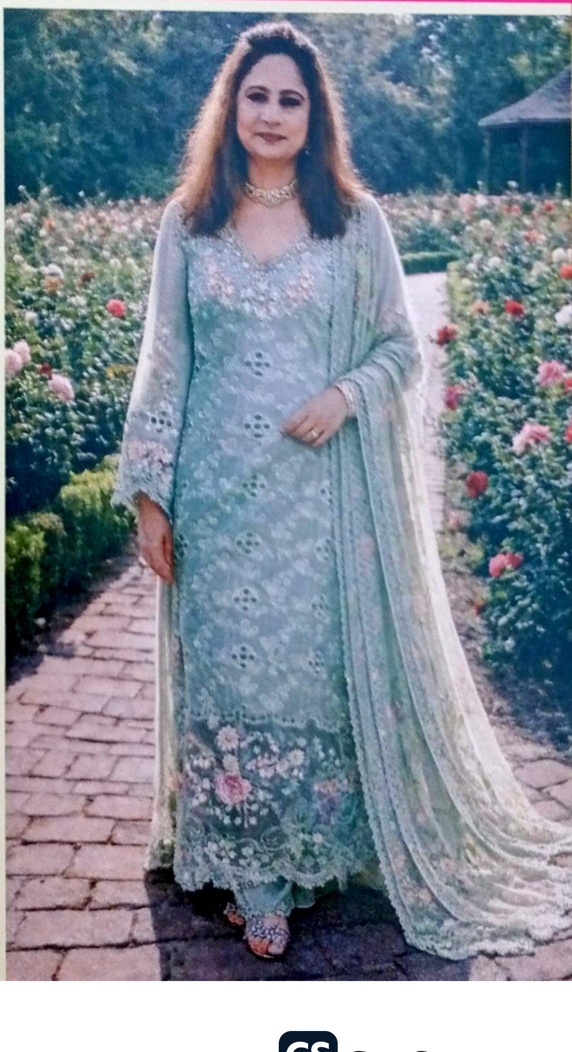

CamScanner

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

MONTHLY Arzang LAHORE

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

مئی 2026ء جلد 27 شمارہ 5

مدیر اعلیٰ

- عامر بن علی

مدیران

- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت

- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلسِ مشاورت

- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط وکتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ ''ارژنگ'' کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت ، 2

مضامین:

- ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا / ڈاکٹر علی محمد خاں ، 3
- چودھری اللہ وسایا / عطاء الحق قاسمی ، 7
- ریٹائرمنٹ کے بعد لکھا گیا ایک نوٹ / اصغر ندیم سیّد ، 9
- میر اور اقبالؔ...... مشترک شعری فکری پہلو / ڈاکٹر محمد اشرف کمال ، 11
- سرسیّد - بے حجاب / محمد فاروق عزمی ، 15
- علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ کیسے لگا / ظفر سیّد ، 17

شعری گوشہ:

- احمد ندیم رفیع کی شاعری سے انتخاب / حسن عباسی ، 20
- سجاد راکب ، کامران ناشط ، 21 تا 22

مضامین:

- اساسِ اُردو اور یورپین عسکری اہلِ قلم / شاکر کنڈان ، 23
- اردو ادب کے لاپتہ کردار / لبنیٰ صفدر ، 28

انٹرویو:

- بقیہ انٹریو: عمرانہ مشتاق ، 30
- بقیہ انٹریو: ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ، 33

شاعری 36 تا 38

کالم:

- نقشِ فریادی ہمارے عہد میں / عامر بن علی ، 39

مضمون: ○ بہادر شاہ ظفر / مرزا کاظم رضا بیگ ، 40

افسانے:

- سناٹا، سرخ آنکھیں، سترہواں سال / سئیعہ مرزا ، 43
- اللہ کا دین / آسناتھ کنول ، 47
- ایک خواہش جو پوری نہ ہوئی / ایاز احمد ، 50
- دھکا اسٹارٹ / جاوید جواد حسین ، 52

تبصرہ کتاب

- 999 ٹریلین ڈالر کی کتاب / انوار احمد بگوی ، 54
- ادبی تقریبات ، 55

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

CamScanner

حمد

میں تجھ سے لطف وعنایت کی اک نظر مانگوں
اندھیری رات سے اپنے لیے سحر مانگوں
میں جب بھی ہاتھ اُٹھاؤں قبول ہو جائے
دعا میں اپنی میں ایسا کوئی اثر مانگوں
پلک جھپکتے پہنچ جاؤں میں ترے در تک
اُڑان کے لیے اتنے تو بال و پر مانگوں
نہیں طلب مجھے فردوسِ حور و غلماں کی
سکونِ قلب کی خاطر میں تیرا در مانگوں
ہو صبح و شام ترے ذکر سے یہ دل معمور
تری ثنا کے لیے لفظ ، عمر بھر مانگوں

پروفیسر ساجد حسین بخش

نعت

حریمِ دل میں اب اسمِ محمدؐ کی ہیں تنویریں
چمکتی ہیں نگاہوں میں حسیں طیبہ کی تصویریں
بیاں جن میں ملے سرکارؐ کی توصیف و مدحت کا
نہایت خوشنما لگتی ہیں وہ اُجلی سی تحریریں
حریم روضۂ اقدس میں حاضر ہو کے جب میں نے
طلب کی مغفرت، بخشی گئیں سب میری تقصیریں
محبت اور ادب سے جو درِ اقدس پہ آ جائیں
سنور جاتی ہیں پھر لاریب بگڑی اُن کی تقدیریں
جو رکھیں اپنی آوازوں کو اُونچا صوتِ نبویؐ سے
بایں صورت خدا سے پائیں گے وہ سخت تعزیریں
ہر اِک ذرہ ہے طیبہ کا مقدس نور کا پیکر
عیاں ہوں نور کے عالم اگر ذرّوں کے دل چیریں
نگاہِ عشق میں طیبہ ہے سب فردوس کی صورت
مناظر چار سو آئیں نظر جنّت کی تصویریں
رہے ہر سمت طیبہ میں کبھی محوِ خرام آقاؐ
وہاں موجود ہیں اُنؐ کے نقوشِ پا کی تنویریں
احد ہو یا بقیع ہو یا قبا و مسجدِ نبویؐ
وہاں شمس الضحیٰ کی چار سو پھیلی ہیں تنویریں

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/ لاہور

اُنؐ کی وابستگی ملی ہے مجھے
بس اسی بات کی خوشی ہے مجھے
کر رہا ہوں میں یاد دل سے انہیں
اُنؐ کی خوشبو بھی آ رہی ہے مجھے
کاش ہو جائے حق ادائی کوئی
آلِ احمدؐ سے دل لگی ہے مجھے
دیکھ کر دیکھتے رہو گے انہیں
روز یہ آس چھیڑتی ہے مجھے
کیوں نہ اطوار اُنؐ کے اپناؤں
اپنی عقبیٰ سنوارنی ہے مجھے
خوابِ غفلت سے اُنؐ کی چاہت شمس
اب تو بیدار کر چکی ہے مجھے

زاہد محمود زاہد/ ملتان

سرکارِ دو عالم کی ثنا کرتے ہیں ہم لوگ
چھوٹے ہیں مگر کام بڑا کرتے ہیں ہم لوگ
سینے سے لگا لیتے ہے اللہ کی رحمت
جب صلی علیٰ صلی علیٰ کرتے ہیں ہم لوگ
صد شکر کہ سادات گھرانے کے ہیں نوکر
حسنین کے نانا سے وفا کرتے ہیں ہم لوگ
قرآن میں ہیں شانِ محمد کے حوالے
اس شان سے قرآن پڑھا کرتے ہیں ہم لوگ
جب جب بھی دُعا کے لیے ہم ہاتھ اُٹھائیں
آخر میں مدینے کی دعا کرتے ہیں ہم لوگ

زعیم رشید ایڈووکیٹ

جا رہا ہوں درِ نبی کی طرف
تیرہ رستوں سے روشنی کی طرف
جس میں آقاؐ کے رات دن گزرے
چل پڑا ہوں اُسی گلی کی طرف
جب سے دل میں بسی ہے یاد اُن کی
ہے رواں زیست بہتری کی طرف
گنبدِ سبز دیکھنے کے بعد
کیوں میں دیکھوں بھلا کسی کی طرف
بار بار اب تو دھیان جاتا ہے
اُن کے روضے کی دلکشی کی طرف

مظہر امام/ امریکہ

یہ سخن پروری حضور سے ہے
نعت کی شاعری حضور سے ہے
چار سو تیرگی کے عالم میں
ہر طرف روشنی حضور سے ہے
جس نے بخشا شعور مدحت کا
یہ مری آگہی حضور سے ہے
خوشبوؤں میں بسے ہیں لفظ مرے
سوچ کی تازگی حضور سے ہے
جس قدر بھی ہے اس زمانے میں
ساری عزت مری حضور سے ہے
کر سکے کون ہمسری اُن کی
جن کی وابستگی حضور سے ہے
ان کی نسبت نے غم تمام کیے
زندگی میں خوشی حضور سے ہے
جو میسر ہے منظروں کو امام
سب کی سب دلکشی حضور سے ہے

مظہر امام/ امریکہ

ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا

ڈاکٹر علی محمد خاں/ لاہور

یہ آج سے تقریباً چونتیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے۔ مَیں اُس زمانے میں گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر آف اُردو تھا اور انٹرمیڈیٹ کے علاوہ بی اے کی کلاسز کو اُردو پڑھایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں فسٹ ایئر کی کلاسز کے لیے اردو لازمی کی کتابیں علیحدہ علیحدہ نہ تھیں بلکہ گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے ایک ہی کتاب تھی۔ مَیں اسے اپنی خوش قسمتی پر محمول کروں گا کہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور نے، جس کا موجودہ نام پیکٹا (پنجاب ایجوکیشن، کریکولم، ٹریننگ اینڈ اسسمنٹ اتھارٹی) ہے، کمال شفقت سے مجھے بھی بحیثیت ایک ورکنگ ٹیچر کتاب کے مرتّبین میں شامل کرلیا۔ دیگر مرتّبین میں ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زَہرا، مسز نسیم حبیب صاحبزادہ، ڈاکٹر انور محمود خالد، امجد اسلام امجد اور نصیر احمد بھٹی شامل تھے۔ اس کتاب کی کوآرڈینیٹر اور مدیرہ ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زَہرا تھیں۔ کتاب کو مرتّب کرنے کے سلسلے میں ہماری دو میٹنگز تو پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور متصل قذافی سٹیڈیم لاہور میں ہوئیں جہاں تمام مرتّبین نے باہمی مشاورت سے اپنے اپنے لیے کام بانٹ لیے مگر ڈاکٹر عارفہ سیّدہ نے یہ کہتے ہوئے کہ تمام رفقائے کار میں واحد ورکنگ ٹیچر آپ ہیں، سب سے زیادہ کتاب کو ترتیب دینے کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا۔ اگر آپ تعلّی پر محمول نہ کریں تو عرض کروں کہ ان دنوں میں اپنی کلاسوں کو بڑا زور لگا کر پڑھایا کرتا تھا اور مجھ میں کام کرنے کا جذبہ بھی وافر تھا، اس لیے مَیں نے اسے بے چُون وچرا قبول کرلیا۔ اُن دنوں ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زَہرا پہلے تو لاہور کالج برائے خواتین میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتی تھیں مگر جلد ہی وہ پرنسپل کی حیثیت سے گورنمنٹ گرلز کالج گلبرگ میں جولائی ءکو تعینات ہوگئیں جہاں سے وہ جنوری ءکو سرکاری ملازمت سے سبکدوش (ریٹائر) ہوئیں۔ گویا میٹرک کی سند میں ان کی تاریخ ولادت جنوری ء مندرج ہے۔ انھوں نے وقت کی یاوری کرتے ہوئے اپنی پرنسپلی کے زمانے میں مجھے چند بار اپنے کالج آنے کی دعوت دی اور چوں کہ انھیں ایک دن باتوں ہی باتوں میں معلوم ہوگیا کہ میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا پی ایچ۔ڈی کا اکلوتا شاگرد رہا ہوں، وہ اُن کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوگئیں اور پھر تو انھوں نے مجھے اپنا استاد بھائی سمجھتے ہوئے مجھ پر کچھ زیادہ ہی بھروسا اور اعتماد کرلیا۔

نصاب کا تقاضا تھا کہ کتاب کا مرتّب یا مرتّبین میں سے کوئی ایک حالاتِ حاضرہ کے اہم موضوعات میں سے یورینیم کے موضوع پر یا ماحولیاتی آلودگی پر خود مضمون لکھے اور پنجاب یا دیگر صوبوں کی دو لوک داستانیں بھی شامل کرے۔ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔ ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زَہرا نے اس حوالے سے نصاب کے تقاضوں کی ذمہ داری یہ کہتے ہوئے میرے کندھوں پر ڈال دی: مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ سب کام بحسن وخوبی کرلیں گے۔ ادھر مَیں نے بھی اس امر کو اپنی خوش قسمتی پر محمول کیا کہ پنجاب بھر میں انٹرمیڈیٹ سطح کے تمام طالب علم میرا لکھا ہوا مضمون پڑھیں گے، اس ذمہ داری کو نبھانے کا بخوشی وعدہ کرلیا۔ اس معاملے میں ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زَہرا نے مجھ پر شفقت یہ کی کہ دو علاقائی لوک داستانوں کے انتخاب کے لیے اپنے کالج کی لائبریری میں سے کچھ متعلقہ کتابیں خود منتخب کیں اور اس حوالے سے مزید اعانت کا وعدہ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں مَیں جب بھی ان کے کالج میں جاتا تھا، وہ کام کی تکمیل کی پُرسش کے ساتھ ساتھ میری چائے وائے کا بھی خیال رکھتی تھیں اور مَیں ان کی اس عزّت افزائی پر بہت شکرگزار تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ اُن دنوں ایک چیلنج سمجھتے ہوئے ماحولیاتی آلودگی کے موضوع پر طلبہ کے لیے مضمون لکھنے کے لیے مَیں نے سرگاڑی اور پاوں پہیا کردیا اور مُیسّر مواد میں سے لاہور اور گردونواح کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے مشق سمیت کتاب کے چودہ صفحات پر مشتمل مضمون لکھ مارا اور ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زَہرا کو دکھانے کے لیے کشاں کشاں ان کے کالج پہنچا۔ مجھے اس وقت بڑی مسرّت ہوئی جب انھوں نے بیان کی ایک آدھ درستی کے بعد میرا مضمون میرے ہی نام سے شاملِ کتاب کرلیا۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے، مَیں نے سمجھا کہ میری محنت پھل ہوگئی۔ مزید برآں جب انھوں نے میری انتخاب شدہ پنجاب کی لوک داستان بعنوان چغل خور جس کے مترجم شفیع عقیل (۱۹۳۰ء-۲۰۱۳ء) تھے اور براہوی لوک کہانی بہادر خاں کی سرگزشت جس کے مترجم پروفیسر انور رومان (۱۹۲۴ء-۲۰۱۳ء) ہیں، بغیر کسی حیل وحجت مِن وعَن شاملِ کتاب کرلیں تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ مجھے اس جگہ ایک پُرلطف بات کا تذکرہ بھی ضرور کرنا چاہیے، وہ یہ کہ جب کتاب چھپ

گئی اور پنجاب کے علاوہ صوبہ بلوچستان کے بھی تمام کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کلاسز کو پڑھائی جانے لگی تو وفاقی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان اسلام آباد کی طرف سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو اس کتاب کے حوالے سے ایک توصیفی خط (Appreciation Letter) موصول ہوا اور اس خط کا ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا کو پتا چلا تو مجھے ان کا فون آیا اور انھوں نے مجھے کسی وقت اپنے کالج میں آنے کو کہا اور توصیفی خط دکھایا جس سے میرے جوش و جذبے کے ساتھ کام کرنے کے ارادوں کو مزید تقویت ملی۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ ان تمام باتوں کا کریڈٹ ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا کو جاتا ہے ۲۰۰۱ء کیوں کہ میرے خیال میں اس کتاب میں جتنی خوبیاں تھیں وہ ان کے ذہنِ رسا کی اختراع تھیں جس کا پھل مجھے یہ ملا کہ جب ء میں نیا نصاب آ گیا اور سیکنڈ ایئر کے لیے نئی کتاب تیار ہونے لگی تو پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے مجھے بھی یکے از سہ مرتبین بدستور شامل رکھا۔ دوسرے دو مرتبین پروفیسر جعفر بلوچ (مرحوم) اور ڈاکٹر عبدالغنی فاروق (مرحوم) تھے۔ یہ کتاب پچیس سال سے تادمِ تحریر شاملِ نصاب ہے اور بے شائبہ و بلا مبالغہ اس کتاب کی وجہ سے میری عزت افزائی پہلے سے کہیں زیادہ ہوئی۔

خیر بات رفت گزشت ہوئی اور درآں حالے کہ ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا گورنمنٹ ملازمت سے اکیسویں گریڈ میں ۳۱ جنوری ۲۰۰۲ء کو سبکدوش (ریٹائر) ہو گئیں مگر جلد ہی وہ وسیع النظر اور دانش ور ماہرِ تعلیم ہونے کی بنا پر پنجاب پبلک سروس کمیشن لاہور کی ممبر بن گئیں جہاں چیئرمین نے انھیں تعلیمی لحاظ سے وسیع تجربے کی بنیاد پر بشمول مقابلہ جاتی امتحانات کے تمام امتحانوں کا نگران مقرر کر دیا۔ اُن دنوں حسنِ اتفاق سے مجھے کمیشن کے کئی امتحانات کا مرتب پرچہ اور ممتحن مقرر کیا گیا تو میرا دوبدو واسطہ پھر ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا سے پڑا۔ ان کے چہرے بشرے سے یوں لگتا تھا کہ مجھے وہ یہاں بھی حسبِ سابق دیکھ کر خوش ہوئیں کیوں کہ انھوں نے میرے بنائے ہوئے پرچوں کی کہ: آپ نے حسبِ عادت بڑی محنت سے پرچے بنائے ہیں میری تعریف کی۔

ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا نے ساری عمر بڑی فعّال زندگی بسر کی تھی اور وہ گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کی روادار نہ تھیں۔ میرا خیال ہے وہ اپنے تین سالہ کنٹریکٹ کے عرصے میں محکمہ تعلیم سے متعلق تقریباً ہر پینل میں شامل رہیں اور ان کی کارکردگی کی وجہ سے پنجاب پبلک سروس کمیشن کے وقار میں ہر آن اضافہ ہوا اور ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کا چرچا بڑھا۔

ابھی وہ ۲۰۰۵ء میں پنجاب پبلک سروس سے سبکدوش ہی ہوئی تھیں کہ قومی خواتین کمیشن اسلام آباد کے اربابِ اختیار نے انھیں قومی سطح پر خواتین کے کمیشن کی چیئرپرسن تعینات کر دیا جہاں انھوں نے اپنی دسترس میں رہ کر خواتین کے جائز حقوق کے لیے بڑی جدوجہد کی۔

ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا کا اوڑھنا بچھونا پڑھنا پڑھانا تھا اور ایف سی کالج، یونیورسٹی کے پارکھ ریکٹر ڈاکٹر پیٹر ایچ آرماکوسٹ کو اس بات کا بخوبی علم تھا۔ چناں چہ انھوں نے اُن کو اگست ۲۰۰۹ء میں ایف سی کالج یونیورسٹی میں بطور ہسٹری پروفیسر شامل ہونے کی پیش کش کی جسے ڈاکٹر عارفہ نے بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب مَیں ایف سی کالج یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے چیئرمین کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک دن حسنِ اتفاق سے انھوں نے مجھے اور مَیں نے انھیں پہلی بار اس حالت میں حیرانی سے دیکھا کہ ہم دونوں ای (E) بلڈنگ کی لفٹ میں سوار ہو رہے تھے اور ہم دونوں نے اپنے اپنے گلے میں یونیورسٹی فیکلٹی شناختی کارڈ حمائل کر رکھے تھے۔ بس اس وقت مَیں نے انھیں فقط اتنا کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں کسی وقت آپ کے ڈیپارٹمنٹ میں حاضرِ خدمت ہو جاؤں جس پر انھوں نے جواب دیا: ضرور تشریف لائیں لیکن آنے سے پہلے مجھے فون کر لینا تاکہ آپ کا آنا حسبِ منشا رہے۔ مَیں نے ان کے ہامی بھرنے کو غنیمت سمجھا اور اگلے ہی روز انھیں فون کر دیا۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت وہ اپنے تدریسی فرائض سے فارغ ہو چکی تھیں اور اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ایک رفیقِ کار کے ساتھ بڑے خوش گوار موڈ میں چائے پی رہی تھیں۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا اس طرح استقبال کیا کہ میرے ساتھ حسبِ عادت مصافحہ کیا اور میرے آنے کی غرض و غایت دریافت کی تو مَیں نے انھیں بتایا کہ پہلے تو ہم ایک دوسرے کو نصابی کتاب کی ترتیب یا ممتحن پرچہ جات کی حیثیت سے ملتے رہے ہیں لیکن اب ایف سی کالج، یونیورسٹی میں رفیقِ کار کی حیثیت سے مل رہے ہیں۔ مَیں سرِدست یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ کا چیئرمین ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ انھوں نے کہا: شوق سے کریں۔ اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہے تو گزارش ہے کہ پہلے تو اختصار کے ساتھ اپنے ذاتی کوائف بالخصوص تعلیم و تعلّم کے حوالے سے یہ بتائیں کہ آپ نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی اور تقریر کرنے کا لب و لہجہ، جو خواص و عوام میں حد درجہ مرغوب ہے، کیسے حاصل کیا؟ کہنے لگیں:

میرے کوائف میں کیا پڑا ہے۔ میرا تعلّق ایک ایسے تعلیم دوست اور تہذیبی گھرانے سے ہے جہاں تعلیم اور مطالعہ کو خاص اہمیّت حاصل تھی۔ مجھے اپنی

ولادت کی صحیح تاریخ کا تو علم نہیں اور نہ کبھی مَیں نے اس بارے میں کچھ کرید کی، البتہ جو تاریخِ ولادت میری میٹرک کی سند میں لکھی ہے اور جسے میں نے ساری عمر لکھا اور برتا ہے اور جس حساب سے مَیں سرکاری ملازمت سے گورنمنٹ کالج برائے خواتین گلبرگ، لاہور سے بحیثیت پرنسپل سبک دوش ہوئی، وہ ۳۱ جنوری ۱۹۴۲ء ہے اور اب تو اسے ہی درست تسلیم کرنا چاہیے۔ میری جائے ولادت لاہور ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، میرا تعلق ایک ایسے علمی اور تہذیبی گھرانے سے ہے جہاں تعلیم اور مطالعہ کو سب باتوں پر فوقیت حاصل تھی۔ چناں چہ بچپن ہی سے میرا شوق زبان اور مطالعہ کی طرف غیر معمولی تھا۔ چوں کہ گھریلو ماحول علمی گفت گو، کتاب دوستی اور فکری تربیت پر مشتمل تھا اس لیے اس کے اثرات میری شخصیت میں بھی در آئے اور مضبوط علمی بنیاد فراہم ہوئی اور تاریخ و تہذیب اور اُردو زبان و ادب سے گہرا شغف پیدا ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں تقریروں، مباحثوں اور ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصّہ لیا جو آگے چل کر میری ان تدریسی اور خطیبانہ صلاحیتوں کی بنیاد بنا۔ رہی حصولِ تعلیم کی بات تو مَیں نے لاہور کے کئی تعلیمی اداروں میں پڑھا ہے۔ سکول کی تعلیم کے بعد مَیں نے لاہور کالج برائے خواتین سے آنرز کے ساتھ گریجوایشن کی۔ لازمی مضمون انگلش کے علاوہ میرے اختیاری مضامین میں اردو ادب اور ہسٹری تھے۔ بعد ازاں مَیں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے اُردو میں ایم اے کیا۔ چھٹ پنے ہی سے میرے اندر ایک ننھا سا بچہ بیٹھا ہوا ہے جو سیر و سیاحت کا بڑا شوقین اور گاہے ماہے اس کا دل سیر و سیاحت کے لیے بڑا مچلتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت مَیں نے ارادہ باندھا۔ اس وقت میں لاہور کالج برائے خواتین میں اُردو کی اسسٹنٹ پروفیسر تھی اور مَیں نے پی ایچ۔ ڈی کرنے کی غرض سے بحر الکاہل کے اندر امریکہ کی باونویں ریاست ہوائی کے دارالحکومت ہونولولو سے فقط تین چار میل کی مسافت پر ایک خوب صورت وادی منووا کا انتخاب کیا۔ جہاں ہوائی کا معروف ایسٹ ویسٹ سنٹر ہے، جس کے بارے میں بیگم اختر ریاض الدین (۱۹۲۸ء - ۲۰۰۳ء) نے اپنے دل آویز سفرنامے دھنک پر قدم پر ایک جگہ لکھا ہے:

اس ایسٹ ویسٹ، کے علاوہ یونیورسٹی کا میلوں میں پھیلا ہوا احاطہ بھی ایک دیدہ زیب سبزہ زار ہے۔ ہر قدم پر گل آویزاں اور روشیں اور بتدریج باڑیں۔ لیکن اس کے علاوہ جو سب سے دل پذیر عنصر اس فضا میں پایا جاتا تھا، وہ تھا بین الاقوامی طلبہ کا ربط ضبط۔ جنوبی بحر الکاہل سے لے کر جاپان، انڈونیشیا، برما، ملایا، فلپائن، کوریا، ویت نام، فجی کے جزائر، آسٹریلیا، پاکستان، ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے جواں سال جویندگانِ علم۔ یہ معاشرتی تنوع بھی ایک تعلیمی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے لڑکے لڑکیوں سے ملنا جلنا، تبادلہ خیالات کرنا، طرح طرح کے کھانے، طرح طرح کے گانے، طرح طرح کے رقص، ہنستے کھیلتے انسان بے شمار نئی باتیں سیکھ لیتے تھے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے بیگم اختر ریاض الدین کے سفرنامے دھنک پر قدم سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ قصہ کوتاہ مَیں سیر و سیاحت کی لطافتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے منووا پہنچ گئی۔ میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا عنوان تھا: سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) انسان کے ساتھ ایک مشن۔ میں عرض کروں کہ مَیں ڈاکٹریٹ کرنے کی غرض سے لاہور کالج برائے خواتین سے گئی تھی اور ۱۹۸۵ء میں وہیں واپس آ گئی اور ۱۹۸۸ء تک وہیں بطور وائس پرنسپل خدمات انجام دیں۔ اس اثنا میں جب میری پروموشن ہو گئی تو ۱۷ جولائی ۱۹۸۹ء کو لبرٹی مارکیٹ کے متصل گورنمنٹ کالج برائے خواتین گلبرگ، لاہور میں بطور پرنسپل تعینات ہو گئی جہاں مَیں ۳۱ جنوری ۲۰۰۲ء تک مسلسل ساڑھے بارہ سال تک ایک ہی جگہ بڑے سکون سے کام کرتی رہی۔ اس عرصے میں مَیں نے بڑے اہتمام کے ساتھ کالج کی کلاسوں میں نظم و ضبط پیدا کیا اور کالج میں ہم نصابی سرگرمیوں کو بیش از پیش بڑھایا جس کی بنا پر کالج کی شہرت ہوئی اور یہاں داخلہ صرف اور صرف میرٹ کی بنیاد پر ہونا قرار پایا اور یہ رسم آج تک بدستور جاری ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم نصابی سرگرمیوں سے، جن کی خوش گوار رسومات کا مَیں نے آغاز کیا تھا، طبقہ نسواں کی صلاحیتوں کو بڑی جلا ملتی ہے۔

یہ امر میرے لیے بڑا خوشگوار رہا کہ جس دن مَیں سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوئی، اس کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی مجھے تین سال کے لیے پنجاب پبلک سروس کمیشن کا ممبر تعینات کر دیا گیا، جہاں میری ذمہ داریوں میں محکمہ تعلیم کے ہر نوع کے امتحانات کا انعقاد تھا اور جہاں اس ضمن میں آپ سے بھی کئی بار دوبدو ملاقات ہوئی۔

انھی دنوں میں مَیں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے بہ مشکل سبک دوش ہوئی تھی کہ ملک میں الیکشن کا زمانہ آ گیا اور مجھے اربابِ بست و کشاد نے عارضی طور پر پنجاب کی صوبائی کابینہ میں بطورِ وزیر شامل کر لیا اور جوں ہی نئی حکومت برسرِ اقتدار آئی، اس نے مجھے ماضی کی خدمات کے پیشِ نظر قومی کمیشن برائے وقارِ نسواں (National Commission on the Status of Women) کی چیئرپرسن تعینات کر دیا۔ ابھی مَیں اپنی نئی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ مجھ سے ایف سی کالج، یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر پیٹر ایچ آرماکوسٹ نے رابطہ کیا اور مجھے یونیورسٹی میں بطور پروفیسر ہسٹری تعینات ہونے

کی پیش کش کی۔ میرا تمام ماضی چوں کہ تعلیم و تعلّم اور تحقیق و تدقیق سے جڑا تھا اس لیے اس پیش کش کو غنیمت شمار کیا اور اگست ۲۰۰۹ء سے آج تک اس یونیورسٹی میں ہوں۔

جب ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا نے اپنے حوالے سے کچھ معلومات میرے گوش گزار کردیں تو مَیں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اجازت طلب کرکے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں چلا آیا۔

ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا دراصل بنیادی طور پر ایک بے مثال ماہرِ زبان، ماہرِ تعلیم اور قابلِ تقلید محقق، مدقّق اور دانش ور تھیں اور باتیں ایسی کرتی تھیں کہ:

''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی''

جہاں تک میرے علم میں ہے وہ ایف سی کالج، یونیورسٹی میں بڑی خوش تھیں اور لہک لہک کر وقت گزارتی تھیں۔ راقم الحروف جب ۳۰ جون ۲۰۱۴ء کو ایف سی کالج یونیورسٹی سے ریٹائر ہوگیا اور پھر سال گزشتہ تک وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس عرصے میں ان سے سرِ راہ بیسیوں بار مڈبھیڑ ہوئی اور انھوں نے حسبِ عادت ہر بار ہی خندہ پیشانی سے بات کی اور میرا حال احوال پوچھا، جس کی بنا پر مَیں ان کے اخلاقِ عالیہ کا مزید گرویدہ ہوگیا۔

ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا سوشل میڈیا پر بڑی فعّال تھیں اور ہر کہ و مہ ان کی اس موقر حیثیت پر اَش اَش بھی ضرور کرتا تھا۔ ان میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اپنی دل آویز گفت گو سے اپنے مخاطب الیہ کو مسحور کردیتی تھیں۔ اس بنا پر اپنی یونیورسٹی میں پسندِ خاص و عام اور ملک بھر میں طبقہ نسواں کی سرخیل تصوّر کی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے ایف سی کالج یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے ان کی پروموشن بطور پروفیسر امریطس کردی، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی یونیورسٹی کے ساتھ تادمِ آخر منسلک رہیں گی۔ ان کا جب جی چاہے گا تو یونیورسٹی آئیں گی اور اگر وقت یاوری نہ کرے تو ان پر کسی طرح کی کوئی قدغن نہ ہوگی لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی یونیورسٹی میں حسبِ معمول آنا جانا اور ہر حال میں رابطہ استوار رکھا۔

علاوہ ازیں وہ مختلف عالمی کانفرنسوں میں بھی بڑے جوش و جذبے کے ساتھ شرکت کرتی تھیں اور بلا مبالغہ ان کی ہر کانفرنس میں حیثیت ایسے گُلِ سرسبز کی ہوتی تھی جس کی مہک ہر چار سُو پھیل جاتی ہے۔ مَیں نے ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا کے بیسیوں لیکچرز دو بدو اور فیس بک پر سنے ہوں گے، مجھے ہر بار ہی یہ احساس ہوا کہ وہ عقل و خرد پر جنون کو ترجیح دیتی ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک بقولِ علاّمہ اقبال:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہمیشہ ہی یہ رویّہ رہا۔ مگر افسوس شاید انھیں عالمِ بالا میں جانے کی جلدی تھی کہ انھوں نے ۱۰ نومبر ۲۰۲۵ء کو دنیائے فانی کو الوداع کہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوگئیں اور وہ لاہور کے کیولری گراونڈ کے گورستان میں، جہاں ان کے خاندان کے کچھ افراد بھی مدفون ہیں، منوں مٹی تلے محوِ استراحت ہیں۔

موقع کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کی سطور میں اُن کی چیدہ چیدہ اچھوتی اور دل آویز باتوں کا تذکرہ کردیا جائے۔ ان کا کہنا تھا:

مجھے زندگی میں بہت سے اعزاز ملے لیکن آپ کا شاگرد یہ سوچ کہ آپ عقل کے بجائے جنون سے زندہ رہے تو زندگی کی ایک دفعہ نہیں، کئی دفعہ قیمت وصول ہوجاتی ہے۔

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہے کہ آپ کو کچھ معلوم نہ ہو۔ تعلیم شعور دیتی ہے اور ایک راستہ بتاتی ہے منزل کی طرف جانے کے لیے اور اس منزل کا نام علم ہے۔ اس منزل کو جو چیز روشن کرتی ہے وہ میرا پسندیدہ تصور ہے، میرے دل سے لگا خیال ہے، وہ تربیت ہے۔

زندگی ریسٹورنٹ کا مینیو کارڈ نہیں ہے کہ جس پر آپ نشان لگا دیں، وہی ڈش آجائے۔ زندگی بڑی عجیب چیز ہے، نشان کسی اور پر لگاتے رہتے ہیں، آتا کچھ اور ہے۔

موجودہ دور میں معاشرے کی ترجیحات دیکھیے۔

اخبار میں اشتہار آتا ہے: ایک ہزار کا پیزا سستا ہے۔ چار لوگ کھا سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک پیپسی کی بوتل راحتِ جاں کے لیے مفت ساتھ آتی ہے۔ جب کوئی ہم سے کہتا ہے کہ پانچ سو روپے کی کتاب خرید لو تو ہم کہتے ہیں کہ کتابیں بہت مہنگی ہوگئی ہیں۔ ایک ہزار روپے کا پیزا چار لوگ کھاتے ہیں اور صبح تک اس کو کسی تہذیب میں شمار نہیں کیا جاتا جب کہ پانچ سو روپے کی کتاب ایک شخص خریدتا ہے اور شاید سو لوگ اس کو استعمال کرسکتے ہیں اور وہ ہمیشہ تہذیب میں شمار کی جاتی ہے۔

جو بات سنجیدگی سے سرگوشی میں کہی جاتی ہے، وہ نسلوں کے کانوں تک پلٹ پلٹ کے آتی ہے۔

جو نقصان نہیں اٹھا سکتا، اسے کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میرا کوئی نقصان ہے تو کسی کا فائدہ ضرور ہوگا۔ مگر اب ہماری زندگی میں وہ رہا نہیں۔

اس کے علاوہ ان کی اور بھی ایسی خوب صورت اور دل آویز باتیں ہیں جو سوشل میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا کا شمار اُن چنیدہ اساتذہ میں کریں جو ہمہ وقت زندگی کے اعلیٰ و ارفع کامیابی کے راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ آیندہ نسلیں ان کے اقوالِ زرّیں سے استفادہ کرسکیں۔ وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِیْن

چودھری اللہ وسایا

عطاء الحق قاسمی/لاہور

کھیلوں سے ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں چنانچہ ہم ان مقبول زمانہ کھلاڑیوں سے بھی پوری طرح متعارف نہیں جن کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے لیکن ایک اتھلیٹ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف ہم یا ان کے حلقے کے کچھ دوسرے لوگ جانتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو ان کے نام کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجنا چاہیے کہ وہ جس فیلڈ کے اتھلیٹ ہیں، اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہ ہمارے دوست چودھری اللہ وسایا ہیں یہ کھانے کے اتھلیٹ ہیں۔ ہم نے بہت سی نجی اور اجتماعی دعوتوں میں انہیں فن کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے اور ہر بار دانتوں میں انگلی داب کر رہ گئے ہیں۔ کھاتے وقت ان پر استغراق کا عالم کچھ یوں طاری ہوتا ہے کہ انہیں گرد و پیش کی کچھ خبر نہیں ہوتی بالکل اسی طرح جیسے ایک فطری شاعر شعر کہتے وقت ایک خود فراموشی کے عالم میں نظر آتا ہے اور ایک ستار نواز ستار بجاتے ہوئے دنیا و مافیہا سے غافل ہوتا ہے۔ در اصل چودھری اللہ وسایا موت کو ایک اٹل حقیقت سمجھتے ہیں چنانچہ وہ ہر کھانے کو اپنی زندگی کا آخری سمجھ کر کھاتے ہیں۔ چودھری صاحب میں ایک صفت یہ ہے کہ وہ اس زمین پر اگنے والی ہر چیز کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قابل قدر نعمت خیال کرتے ہیں، چنانچہ ان میں سے جو چیز بھی دستر خوان پر آ جائے، وہ اس سے منہ نہیں موڑتے کہ ان کا خیال ہے انسانوں کی طرح کھانے پینے والی چیزوں کے بھی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے منہ موڑ کر ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگانا چاہیے۔ چنانچہ اگر دو من لکڑیاں بھی ابال کر ان کے سامنے رکھ دی جائیں تو وہ نمک چھڑک کر کھا جائیں گے۔

تاہم ہمارے اس بیان سے یہ مفہوم بھی اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ چودھری اللہ وسایا خوش خوراک نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں، در اصل معاملہ خوراک کی دستیابی کا ہے چونکہ ان کا موٹو جیسی مل جائے، جہاں سے مل جائے "ہے، لہٰذا وہ چوزی صرف اس وقت نظر آتے ہیں جب ان کے سامنے چوز کرنے کے لئے کوئی ورائٹی ہو۔ ان کی مرغوب غذا مرغ ہے جسے وہ بزبان پنجابی ککڑ " کہتے ہیں اور یہ لفظ زبان سے ادا کرتے وقت ان کے سارے چہرے پر دانت اگ آتے ہیں۔ ایک محفل خورد و نوش میں ان کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز ہمیں بھی حاصل ہوا۔ "یہ اعزاز " کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ جس محفل خورد و نوش میں وہ شریک ہوں 'اس کے دیگر شرکاء کے حصے میں کھانا نہیں، بس اعزاز ہی آتا ہے۔ اس روز ہم حیران ہوئے کہ لوگوں نے کھانا بھی شروع کر دیا لیکن چودھری اللہ وسایا پوری بے نیازی سے اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو بولے۔ میں پرہیزی کھانا کھاتا ہوں "۔ تھوڑی دیر بعد بیروں نے یہ پرہیزی کھانا بھی میزوں پر سجانا شروع کر دیا۔ اور یہ ککڑ "تھا جو بھی "سرد "ہونا باقی تھا اور چودھری صاحب اس راز سے واقف تھے ان کے پرہیزی کھانے کی ایک شق یہ بھی سامنے آئی کہ وہ ایسے مواقع پر شوربے سے پرہیز کرتے ہیں اور صرف بوٹیوں پر گزارا کرتے ہیں سو اس روز ہم نے دیکھا کہ آخری آدمی جو ان کے پاس کھڑا تھا وہ بیرا تھا اور وہ پلیٹ کے خالی ہونے کا منتظر تھا۔ چودھری اللہ وسایا برابر میں رکھی ہوئی پلیٹ میں ہڈیاں ڈال رہے تھے ہم نے پلیٹ دیکھی تو چنگیز خان کے لگائے ہوئے کھوپڑیوں کے مینار یاد آ گئے!

چودھری اللہ وسایا صرف کھانے پینے کے حوالے ہی سے قابل ذکر شخصیت نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں خصوصاً شادی بیاہ کی تقریب میں شرکت کو وہ ایک انسانی فریضہ سمجھتے ہیں بلکہ اس ضمن میں وہ خاصے ذمے دار واقع ہوئے ہیں لہٰذا کسی با قاعدہ دعوت نامے کی وصولی کو بھی ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ وہ کسی ضروری کام سے بھی جا رہے ہوں اور انہیں رستے میں کوئی بارات نظر آئے تو اپنے اس انسانی فریضے کی تکمیل کی خاطر وہ سب کام چھوڑ دیتے ہیں اور باراتیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنا شروع کر دیتے ہیں اس ضمن میں ان کا موقف یہ ہے کہ کسی کے غم میں شریک ہونے سے زیادہ اس کی خوشی میں شریک ہونا ظرف کی بات ہے تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ لوگوں کے دکھ میں شریک نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ اگر ساتویں محلے میں بھی کوئی مرگ ہو جائے اور وہ اگر جنازے میں شریک نہ ہو سکے ہوں تو قل اور چہلم میں ضرور شرکت کریں گے خواہ وہ ذرا تاخیر ہی سے پہنچیں یعنی قرآن خوانی کا مرحلہ گزر چکا ہو اور اب مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے غرباء و مساکین میں جو بصورت مہماں وہاں جمع ہوتے ہیں کھانا تقسیم کیا جا رہا ہو اس صورت میں بھی مرحوم کی روح کو سب سے زیادہ ثواب چودھری اللہ وسایا ہی کی وساطت سے پہنچتا ہے۔ چودھری اللہ وسایا لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے علاوہ

CamScanner

دیگر امور میں بھی بہت سوشل واقع ہوئے چنانچہ انہیں شعر و شاعری سے گو کوئی شغف نہیں مگر مشاعروں میں بھی شرکت کرتے ہیں اور اس موقع پر سامعین کی بجائے شعراء کی صحبت کو پسند کرتے ہیں۔ تاہم کبھی مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے اٹھ آتے ہیں اور کبھی مشاعرے کے اختتام تک محفل میں موجود رہتے ہیں لیکن اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ منتظمین نے شعراء کے کھانے کا انتظام مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے یا اس کے اختتام پر کیا ہے۔ چودھری اللہ وسایا کسی زمانے یں بڑی باقاعدگی سے بڑے بڑے کلبوں کے عشائیوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے مگر اب گیٹ پر دعوت ناموں کی چیکنگ بہت سخت ہوگئی ہے۔
موصوف کے متعلق شنید ہے کہ ایک دفعہ کسی ہال میں ریسلنگ کے مقابلوں کے دوران یہ ناظرین کی صفوں میں بیٹھے تھے۔ مختلف النوع مقابلوں کے دوران یہ بیچ بیچ میں دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لیتے اور کہتے ساڈا آئٹم نہیں آیا ان کے ڈیل ڈول اور بے چینی کو دیکھ کر ناظرین بھی بڑی بے چینی سے ان کی باری کا انتظار کرنے لگے لیکن اس دوران تمام مقابلے ختم ہوگئے حتی کہ سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب ناظرین چائے کے لئے برابر والے ہال میں تشریف لے چلیں اس پر موصوف نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے انگڑائی لی اور کہا "ساڈا آئیٹم آگیا ہے"!

لیکن اللہ کو جان دینی ہے اور چونکہ اس واقعہ کے ہم عینی شاہد نہیں ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ چودھری اللہ وسایا جب دسترخوان پر ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کھانوں میں بھگدڑ مچ گئی ہے اور وہ اپنے دفاع میں ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ گو یہ سارا منظر نظر نہیں آتا لیکن چودھری اللہ وسایا کے دونوں ہاتھ "دشمن" کے تعاقب میں جس طرح ادھر ادھر لپک رہے ہوتے ہیں۔ اس سے ہمارے خدشے کی تصدیق ہوتی ہے۔ موصوف کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے پتلون کی بیلٹ ڈھیلی کر لیتے ہیں اور اوپر کے دو بٹن بھی کھول دیتے ہیں۔ تاہم ایک احتیاط وہ یہ برتتے ہیں کہ اس دوران لمبا سانس نہیں لیتے لیکن ایک دفعہ خواتین و حضرات سے بھری محفل میں ان سے یہ بے احتیاطی ہو ہی گئی جس کا مردوں نے بہت برا مانا۔ بہرحال چودھری صاحب کو ایک تشویش جو بہت بری طرح لاحق ہے وہ یہ ہے کہ موصوف اپنے حکیم صاحب کی ہدایت پر عمل نہیں کر پاتے۔ انہیں حکیم صاحب کی ہدایت یہ ہے کہ کھانے کے دوران اگر ڈکار آجائے تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے لیکن انہیں ڈکار نہیں آتا اس کے باوجود ایک مرحلے میں انہیں مجبوراً کھانے سے ہاتھ کھینچنا پڑتے ہیں اور یہ مرحلہ وہ ہوتا ہے جب محفل کے اختتام پر بیرا یا میزبان ان کے پاس کھڑا انہیں خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

ہاں ایک محفل ہمیں ایسی یاد ہے جس میں آخر تک ایک شخص ان کے ساتھ شانے سے شانہ ملائے کھڑا رہا اور کھانے کے اس مقابلے میں وہ انہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا رہا۔ بالآخر چودھری اللہ اسایا نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اور اس وقت ان کے چہرے پر وہی تشویش تھی جو حکیم صاحب کی ہدایت پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے انہیں لاحق رہتی ہے جب کہ ان کے برابر میں جو صاحب کھڑے تھے بلکہ ڈٹے ہوئے تھے، وہ خاصے بزرگ تھے اور کھانے کے دوران مسلسل ڈکار رہے تھے۔ تاہم ان کے چہرے پر تشویش کی بجائے شانتی ہی شانتی تھی۔ کیونکہ ان کے حکیم صاحب نے انہیں غالباً یہ بتایا تھا کہ ڈکار کا مطلب یہ ہے کہ پہلا کھانا ہضم ہوگیا ہے اس روز چودھری اللہ وسایا نے ہمارے ساتھ ایک جگہ جانا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب ہم نے انہیں چلنے کو کہا تو انہوں نے اس بزرگ کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور کہا "ابا جی اب چلیں قاسمی صاحب کو دیر ہو رہی ہے!"

⊙⊙⊙

بہ یاد: سید قاسم محمود
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور پاکستان
Book Digest
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرتعاون مبلغ/-2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل
جاز کیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جا سکتا ہے
0321-4377794
Upaisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
برائے خط کتابت ترسیل زر/رابطہ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

ریٹائرمنٹ کے بعد لکھا گیا ایک نوٹ

اصغر ندیم سیّد/ لاہور

میں ایک یونیورسٹی پروفیسر ہوں۔ اپنی مدت ملازمت پوری ہونے پر ریٹائر کر دیا گیا ہوں۔

مجھے بخوشی فارغ کر دیا گیا کیونکہ جو میں پڑھانا چاہتا تھا، مجھے نہیں پڑھانے دیا گیا۔ اوسط درجے کے معمولی چاپلوس پروفیسر مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حاسد اور حسرتوں کے مارے پروفیسر میرے خلاف نالائق طالب علموں کو استعمال کر کے سازشیں کرتے تھے۔ میں خاموشی سے سب دیکھتا رہا۔ باہر کی یونیورسٹیوں اور ملکوں سے کانفرنسز میں شرکت کے دعوت نامے غائب کرتے رہے۔ مارشل لاء حکومتوں میں میرے جیسے اساتذہ کے خلاف پمفلٹ نکالتے رہے۔ خوشامد کے زور پر ہر طرح کی ترقیاں لینے والے Best Teacher ایوارڈ لیتے رہے۔ پڑھانے کی بجائے وائس چانسلروں کے ذاتی کام کرتے رہے۔ ترقیوں کے لیئے ریسرچ کے نام پر بھوسہ بھرے پیپرز چھپواتے رہے۔ بڑی کامیابی سے غیر جمہوری حکومتوں کو اخلاقی جواز فراہم کرتے رہے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کا نعرہ لگانے والے جابر سلطانوں کے جوتے چاٹتے رہے۔ میں یہ سب دیکھتا رہا اور میں اُن کی بنائی ہوئی ترتیب شدہ کتابیں پڑھانے پر مجبور ہوتا رہا۔ یونیورسٹیوں کے کلچر میں علم اور شفافیت کی جگہ تعصب، تنگ نظری اور سازشوں کو پلتے دیکھتا رہا۔ ہم اندھوں میں کانے راجے پیدا کرنے کو اپنی کامیابی سمجھتے رہے۔ میں جو پڑھانا چاہتا تھا، نہ پڑھا سکا اور جو نہیں پڑھانا چاہتا تھا وہ پڑھانے پر مجبور رہا۔

آج اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو شاگرد پیدا کیئے وہ ڈاکٹر، انجینئر، بینکر اور اُستاد بنے۔ مگر اُن میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ اس کا اندازہ مجھے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ جب میں اپنے زخموں کے علاج کے لئے چھ دن ہسپتال میں رہا تو چھ لاکھ کا بل دیکھ کر بلبلا اُٹھا۔ میرے کسی شاگرد نے کان میں کہا، سر یہ تو آپ کو دینا پڑے گا کہ آپ نے ہمیں جو پڑھایا اُس میں تو یہی کچھ ممکن ہے۔

پھر جب میں انجیوگرافی کے لیئے داخل ہوا تو میرے شاگرد ڈاکٹر نے میرے کان میں کہا، سر اگر سرکاری علاج کرانا ہے تو دو سال بعد باری آئے گی اور اگر جیب سے علاج کرائیں گے تو دس منٹ میں باری آ جائے گی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اس نے کہا جو آپ نے پڑھایا اُس میں بس یہی ہو سکتا ہے۔

ایک دن کسی کام سے سیکریٹریٹ گیا۔ سیکریٹری کو اپنے نام کی چٹ بھیجی، اُس نے مجھے نہیں بلایا۔ میں ڈھیٹ بن کے بیٹھا رہا۔ جب وہ کسی میٹنگ میں جانے کے لیئے آفس سے نکلا تو میں سامنے آ گیا۔ میں نے اسے اپنا کام بتایا۔ اس نے کہا سر یہ کام ممکن نہیں ہے۔ آپ نے ہمیں جو پڑھایا تھا اُسے بھلانے میں بہت وقت لگا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ سب بھلا کر اس جگہ پہنچا ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

ایک دن میرے گھر کی بجلی کئی گھنٹے تک نہ آئی تو میں ایس ڈی او کے پاس گیا اور اُس نے مجھے دیکھ کر کہا، سر جو کچھ آپ نے ہمیں پڑھایا تھا اُس میں تو یہ جو بجلی آپ کو مل رہی ہے یہ بھی نہیں ملنی چاہیئے۔

مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ میں نے لولی لنگڑی اور اداس نسلیں پیدا کرنے میں حصّہ لیا۔ تنگ نظری اور تعصب نے پڑھے لکھوں میں کیسے راستہ بنایا۔ پھر کس طرح انتہا پسندی ہمارے معاشرے میں اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ کس طرح بڑے بڑے کالم نگاروں، سیاسی رہنماؤں، دانشوروں اور بیوروکریٹس نے انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کو جواز فراہم کیئے۔ جب ایک خودکش حملہ آور اپنے دل، دماغ اور آنکھ پر پٹی باندھتا ہے تو اس کا ذمہ دار میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔ یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر معصوم اقلیتوں اور مسلمانوں کو جب عبادت گاہوں میں بارود سے اڑاتے ہیں تو اس میں کچھ حصّہ میرا بھی ہے۔

آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے کیا پڑھانا چاہیے تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں یہ پڑھاؤں کہ اللّٰہ کو خوبصورتی پسند ہے۔ جمالیات کیا ہوتی ہے؟ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ جمالیات کے فلسفے پر کئی کتابیں موجود تھیں۔ ہم نے اُن کی طرف رجوع نہ کیا۔ جمالیات کو سمجھے بغیر ہم سبحان اللّٰہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتے۔ مجھے کسی نے یہ پڑھانے نہیں دیا کہ خوبصورتی کی تحسین کیسے کرنا ہے۔ اس میں تمام فنون لطیفہ کی بحثیں آ جاتی ہیں۔ میں جغرافیہ لازمی کرنا چاہتا تھا کہ اللّٰہ کو سمجھنے کی سیڑھی جغرافیہ ہے۔ اُس کی زمینیں، اُس کے موسم، اُس کے جنگل، اُس کے دریا، اُس کے سمندر اور پھر سمندروں میں حیات، جنگلوں میں حیات، پرند چرند، اُن کی نسلیں، ان کی عادات کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ جانوروں سے وابستہ منفی تصورات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ کام ہم نے نہ کیا،

CS CamScanner

غیروں نے کیا۔ نیشنل جیوگرافک چینل سے بہتر یونیورسٹی کوئی نہیں ہے۔

میں پڑھانا چاہتا تھا کہ ہماری تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے۔ میں انسانی تاریخ پڑھانا چاہتا تھا۔ مجھے اغواء شدہ پاکستانی تاریخ پڑھانے پر لگا دیا گیا۔ ظالم بادشاہوں کے قصیدے پڑھنے والے مورخوں نے وہ ٹیڑھی اینٹ رکھ دی جس پر جو عمارت بھی تعمیر ہوئی اُس کی غلام گردشوں میں ضیا الحقوں نے تک نکیاں لگا دیں۔ پپو کے قاتلوں کی پھانسی کے میلے میں پکوڑے اور گول گپے بیچنے والوں نے چاندی کمائی اور انسانوں کو بےحس کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ میں تاریخ مسخ کرنے والوں کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ کن لوگوں نے نظریہ پاکستان کو پوری قوم سے ٹھگ لیا۔ اور پھر اُس پر لمبی چوڑی مارکیٹنگ کی۔ جواب تک جاری ہے۔

میں طلبا کو بتانا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں، کن کونے کھدروں سے کیڑے مکوڑوں کی طرح نکلے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر قائداعظم کو ٹھگنے والے بونوں اور ٹھگنے قد کے لوگوں کو طلباء سے متعارف کرانا چاہتا تھا۔ مجھے روک دیا گیا۔ میں طلباء کو پڑھانا چاہتا تھا کہ ایوب خان کس طرح فیلڈ مارشل بنا اور اُس کے مشیروں نے ادب اور ادیبوں کو خریدنے کے لیئے کس طرح کے گماشتے مقرر کیئے؟ اُس نے شاہی قلعے میں حسن ناصر کو کیسے شہید کیا؟ کس طرح دانشوروں، سیاست دانوں اور باضمیر لوگوں کو ساری رات جگانے کے لیئے حربے استعمال کیئے؟ ان کے ناخن کس طرح پلاس سے اکھاڑے گئے؟ کس طرح ان کی چیخوں کو دبانے کے لیئے اقدامات کیئے گئے؟

ضیا الحق نے کس طرح ادیبوں، شاعروں، وکیلوں (اُس وقت کے وکیلوں) کسانوں اور صحافیوں کے ننگے جسموں پر کوڑوں کے ساتھ گرم پانی کی بوچھاڑ کروائی۔ کس طرح یہ لوگ پاگل ہوئے اور اُن کے گھر والوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اداکارہ شبنم کیس میں راتوں رات ضیاء الحق نے پھانسی کے مجرموں کو کس طرح معافی دلوائی۔ کون شبنم کے گھر گیا اور اُس سے معافی نامہ لے کر آیا۔ میں یہ طلباء کو بتانا چاہتا تھا۔

میں طلباء کو پڑھانا چاہتا تھا کہ سعادت حسن منٹو جب پاکستان آئے ہم نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ چھوٹی عدالتوں میں کس طرح ذلیل کیا۔ روزگار کے سارے دروازے بند کر دیئے۔ دس روپے میں تخلیقی مشقت پر افسانہ لکھوایا۔ قسطوں میں نہیں، یک مُشت مرنے پر مجبور کر دیا۔ پاک ٹی ہاؤس میں اُسے دیکھ کر قیوم نظر اور شہرت بخاری ٹوائلٹ میں ڈر کر کیوں گھسے تھے؟ بقول منٹو اُس نے تو کبھی بھی اُن سے اُدھار نہیں لیا تھا۔

میں منٹو کے افسانے، کھول دو، ٹھنڈا گوشت ،موذیل، بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، شہید ساز اور ننگی آوازیں پڑھانا چاہتا تھا۔ کورس مرتب کرنے والوں نے مجھے روک دیا اور جن اصحاب علم و ادب نے یہ راستہ روکا وہ اس وقت بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پروفیسر ایمریطس ہیں۔

میں فیض کی نظم ڈھاکہ سے واپسی پر پڑھانا چاہتا تھا اور طلباء کو اس مصرعے کا مطلب سمجھانا چاہتا تھا خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد۔ میں ناصر کاظمی کی غزل طلباء کو پڑھانا چاہتا تھا جو سنہ 1971ء کے بعد لکھی گئی، وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے۔ مجھے بس یہ بتانا تھا کہ وہ بھٹیالی گانے والے ہمارے طرز احساس سے کیسے نکل گئے اور مشرقی پاکستان کی ستاون فلمیں جو یہاں ریلیز ہوئیں وہ ہماری فلم انڈسٹری کو یکسر تبدیل کرنے ہی والی تھیں کہ سفر رُک گیا۔ میں بتانا چاہتا تھا کہ قرۃ العین حیدر، بڑے غلام علی خان اور ساحر لدھیانوی پاکستان چھوڑ کر کیوں چلے گئے اور سجاد ظہیر کو مچھ جیل میں کیوں بند کیا گیا۔ میں بہت کچھ پڑھانا چاہتا تھا۔ انتظار حسین کا شہر افسوس، بستی اور ہندوستان سے آیا ہوا خط مجھے نہیں پڑھانے دیا گیا۔ میں امر جلیل کی کہانیاں اور شیخ ایاز کی نظمیں پڑھانا چاہتا تھا۔ اور وہ سارا عالمی لٹریچر اور اپنی زبانوں کا لٹریچر جسے ہم نے اپنے طلباء سے چھپا لیا، وہ سب پڑھانا چاہتا تھا۔ اس طرح میں بھی کوتاہ قد رہ گیا اور میرے طلباء بھی۔

آئینیسکو نے ایک ڈرامہ لکھا تھا، کرسیاں (The Chairs)۔ اس میں ایک ریٹائرڈ افسر رات کے کھانے پر شہر کے تمام بڑے عہدے والے افسروں کو دعوت پر بلاتا ہے۔ جب وہ ایک ایک کرکے آتے ہیں تو سٹیج پر اُن کے وجود کے بجائے اُن کی صرف کرسیاں رکھی جاتی ہیں۔ ان کرسیوں سے میزبان گفتگو کرکے بتاتا ہے کہ صاحبو درحقیقت تو تم صرف کرسیاں ہو۔ تم اس سسٹم میں اپنی شناخت گم کر بیٹھے ہو۔ میں بھی ایک ڈنر پر سب بڑے لوگوں کو بلا کر یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں جو پڑھانا چاہتا تھا کیوں نہیں پڑھا سکا۔ مگر میرا یہ اعتراف صرف خالی کرسیوں سے ہوگا کہ وہ سب افسر اپنا وجود نہیں رکھتے۔

⊙⊙⊙

میر اور اقبال......مشترک شعری اور فکری پہلو

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

میر تقی میر (۱۸۱۰ء وفات) خوش گو، خوش بیان شاعر ہیں جو شیریں سخنی کی وجہ سے مشہور ہیں۔انھوں نے زندگی کے تلخ تجربات کو اپنی زبان کی چاشنی میں ڈھال کے کچھ ایسے بیان کیے ہیں کہ وہ زندگی کو گوارا ہو گئے ہیں۔وہ زندگی کے تلخ تجربات کو بھی اپنی زبان کی شیرینی میں بیان کر کے ان میں اپنا مخصوص رنگ بھر دیتے ہیں۔

میر تقی میر نے اپنی ذات اور اپنے حالات کو جس طرح شاعری کا جامہ پہنایا ہے، اس کی وجہ سے ان کی شاعری اس دور کی تاریخی سیاسی اور سماجی رویوں کی آئینہ داری کرتی نظر آتی ہے۔میر کا اندازِ بیان اور فکری تجربہ بھی آفاقی صورت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔اسی طرح اقبال نے بھی اپنی شاعری میں عصری اور قومی مسائل کے حوالے سے جو لب ولہجہ اختیار کیا ہے وہ اپنے اندر آفاقی پہلو رکھتا ہے۔

دلی میں جس طرح خانہ جنگیوں کی وجہ سے صورت حال دردناک اور ابتر تھی اسی طرح اقبال کے عہد کا ہندوستان سیاسی حوالے سے کئی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔

میر تقی میر شعروسخن میں عالمی شہرت رکھتے ہیں اور اقبال بھی عالمی طور پر اپنے خیالات وافکار کی وجہ سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔دونوں کو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی گوئی پہ بھی قدرت حاصل تھی۔میر کا زمانہ غزل کا سنہری زمانہ تھا جب کہ اقبال کا دور نظم گوئی کی طرف مائل تھا اور اقبال کا فلسفہ اور فکری نظام بھی غزل سے زیادہ نظم کے پیرائے میں موجود ہے۔میر اور اقبال دونوں نے غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی کی ہئیت میں بھی لکھا ہے۔

میر میں اپنی ذات کا احساس تھا خودداری تھی اقبال نے خودی کا درس دیا۔دونوں کی شاعری میں تحرک مرکزی نقطہ کی طرح موجود ہے، اس کے علاوہ دونوں کے ہاں جذبہ عشق اپنا اثر دکھاتا ہے۔دونوں ہجر کو وصل پہ ترجیح دیتے ہیں دونوں کی شاعری میں حالات کی کسمپرسی کی تصویر کشی ملتی ہے، دونوں کی شاعری میں عصری غم واندوہ کا ادراک ملتا ہے۔

میر اور اقبال کی شاعری میں جذبہ اور فکر اپنی بلندی پہ نظر آتا ہے۔دونوں شاعروں کے ہاں ندرتِ خیال اور اسلوبِ بیان کی جدت پائی جاتی ہے۔میر اور اقبال میں فکری اشتراک اور شعری مماثلت کی بات کی جائے تو زمانی بعد کے باوجود اس حوالے سے کئی اشتراکات ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں شاعروں میں اکثر شعری مقامات فنی اور اسلوبی حوالے اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔یہ بات بھی سچ ہے کہ مختلف رویوں اور مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے کے باوجود مقام ومرتبہ کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔

لسانی، فکری اور ذہنی بعد ہونے کے باوجود ان دونوں کی عظمت اور مشترک شعری خصوصیات کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

میر کا زمانہ انگریزی تسلط وقبضہ اور سامراجی اقتدار کے حوالے سے نقطۂ آغاز ہے تو علامہ اقبال کا زمانہ انگریزی سامراجی اقتدار کا نقطۂ انجام۔

میر کے ہاں غم واندوہ اور حسرت ویاس کی داخلی اور جذباتی کسک ملتی ہے۔جب کہ اقبال کی شاعری میں ان کے نظریاتی اور فکری سرمائے کی وجہ سے داخلی احساس کے ساتھ ساتھ خارجی معاملات بھی ملتے ہیں۔

میر کے ادبی کمال کو بڑے بڑے شاعروں نے تسلیم کیا ہے۔غالب، مومن، داغ اور اقبال کی شاعری میں کہیں نہ کہیں میر کا رنگِ سخن اپنا جلوہ ضرور دکھاتا ہے۔

''جس کو آج اقبال کی غزل کا نیا اسلوب سمجھا جاتا ہے اور جس کی روانی میں فکر کی عظمت کی وجہ سے ایک بھاری پن آ گیا ہے اور گھمبیر کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس کے نشانات بھی میر کے یہاں موجود ہیں اور بعض مقامات پر علامتوں ہی کی نہیں بلکہ خیالات کی حیرت انگیز یکسانیت ہے حالانکہ فکری اور جذباتی اعتبار سے میر اور اقبال کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ حائل ہے۔''(۱)

میر کے شعری محاسن بے شمار ہیں جن نے وجہ سے انھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔بقول محمد حسین آزاد:

''میر صاحب کی زبان شستہ کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں۔محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں اسی واسطے اُن میں بہ نسبت اور شعراء کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں یہی سبب ہے کہ دلوں پر بھی اثر زیادہ کرتی ہیں۔..... ان کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت کہیں شیر وشکر ہیں مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آب حیات بہاتے ہیں جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔(۲)

ہندوستان میں یہ اہمیت اور عزت افزائی بھی میر جیسے شاعر ہی کو نصیب ہوئی کہ مسافر ان کی غزلوں کو تحفے کے طور پر ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے تھے۔اور ان کی غزلوں کو پڑھا اور سنا جاتا ہے۔میر کی شاعری کا مقبول ترین حصہ وہی ہے جو کہ

CamScanner

زبان زدِ عام ہے اور جسے قبول عام حاصل ہوا۔

علامہ اقبال کی شاعری بیسویں صدی میں سامنے آئی تو علامہ اقبال اردو اور فارسی کے شعری آفاق پہ ایک تابندہ ستارے کی طرح جگمگا اٹھے۔ اپنے بے مثال انداز اور اسلوبِ سخن کی وجہ سے علامہ اقبال کی شاعری کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ بقول مولوی محمد عبدالستار نائب: ''ہندوستان کی شانِ نبوت دکھانے والی صرف دو چیزیں ہیں بھگوت گیتا اور کلام اقبال۔ سعدی ہند حالی نے ملک میں جس قومی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی اس کو اقبال نے فلک الافلاک تک پہنچایا۔''(۳)

میر اور اقبال کی شاعری میں مماثلت کے لیے ان کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
(میر)

علامہ اقبال کی نظم ''ایک آرزو'' کا یہ شعر دیکھئے:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
(اقبال)

ان کے شعروں کو دیکھا جائے تو میر اور اقبال کے مابین بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ میر کا یہ شعر دیکھئے:

بستی قبا پرتری مرگیا ہے
کفن میر کو دیجیو زعفرانی
(میر)

اقبال کی نظم ''ایک آرزو'' کا شعر دیکھئے:

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
(اقبال)

میر کا تعلق دلی سے تھا اور پھر میر لکھنؤ چلے گئے ان کی شاعری میں دلی اور لکھنو کی شعری خصوصیات ملتی ہیں۔ جب کہ اقبال دلی اور لکھنؤ کے بجائے خود اپنے رنگ میں شاعری کو اہمیت دیتے ہیں

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خم زلفِ کمال کے
(اقبال)(۴)

اقبال نے وسیع مطالعہ کی بنا پر شاعری کے بڑے بڑے اساتذہ کے کلام کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان سے فیض بھی اٹھایا۔ کلیات اقبال کے دیباچہ میں محمد عبدالرزاق لکھتے ہیں لکھا ہے:

''میر کا سوز و گداز، غالب کی جدت واجتہاد، مومن کی نازک خیالی، ذوق کی روانی وصفائی، درد کی تاثیر و دلآویزی، شیکسپیر کی فطرت نگاری، ملٹن کی پرواز فکر، شبلی کی شیریں کلامی، ورڈس ورتھ کی نیچر پرستی، ٹینی سن کی فصاحت، کولرج کی موسیقی، کوپر کی تخئیل اور گیٹے کی حکمت شعاری یہ سب ان کے کلام میں جمع ہیں۔ یہ ان کے کمالِ فن کی دلیل ہے کہ وہ باہمہ اور بے ہمہ ہیں یعنی وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تاہم دوسرے اساتذہ کے رنگ میں شعر کہنے پر ایسی ہی قدرت رکھتے ہیں جیسی اپنی طرزِ کلام پر۔(۵)

اقبال اور میر تقی میر دونوں عشق کو اہمیت دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا مرکزی نکتہ عشق ہے اور عشق کی اس کائنات کی دھڑکن ہے ایسے ہی خیالات میر کے بھی ہیں۔

عشق ہی وشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
اور تدبیر کو کچھ نہیں دخل
عشق کے درد کی دوا ہے عشق
عشق سے جا نہیں کوئی خالی
دل سے لے کر عرش تک بھرا ہے عشق
کوہکن کیا پہاڑ کاٹے گا
پردے میں زور آزما ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہونچا
آرزو عشق ، مدعا ہے عشق
(میر)

اقبال کے کلام میں عشق کے حوالے سے بے شمار شعر موجود ہیں:

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

میر تقی میر محبوب پر عشق میں جان نثار کرنے کو زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش

اقبال بھی عشق میں جان دینے کی بات کرتے ہیں:

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
یہ جانِ بے قرار ہے تجھ پہ نثار کیوں

میر پروانے کو عشق میں جان وارنے کے حوالے سے پیش کرتے ہیں:

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلہ پر پیچ وتاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا
(میر)

میر اور اقبال دو بڑے نام ہیں اور دونوں کی شاعری اور فکری اسلوب اپنی اپنی جگہ مستند ہیں۔ ''دیوان میر'' کے دیباچہ میں علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''فکری اور جذباتی اعتبار سے میر اور اقبال کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ حائل ہے لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں میں بعض مقامات پر علامتوں ہی کی نہیں بلکہ خیالات کی بھی حیرت انگیز یکسانیت ہے۔(٦)

دونوں شاعروں کے ہاں انسانی عظمت خیال اجاگر ہوتا ہے۔ بقول میر:

مت سہل ہمیں جانو ، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے سینے سے انسان نکلتے ہیں

برسوں لگی رہی ہیں جب مہرومہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے
پیدا کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اقبال کا شعر ملاحظہ کیجیے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بانگ درا کا دیباچہ لکھنے والے شیخ عبدالقادر نے اپنے ایک مضمون میں علامہ اقبال کی نظم شکوہ اور میر تقی میر کی واسوخت کی باہمی مماثلت کے حوالے سے بات کی ہے میر نے چار واسوختیں لکھی ہیں۔ جن میں میر نے اپنے محبوب سے یہی شکوہ کیا ہے کہ میں نے اپنے عشق اور توجہ کی وجہ سے تمھیں اتنی اہمیت دی کہ اب ہر شخص تمھاری طرف ملتفت نظر آتا ہے اور تم بھی غیروں کو ترجیح دینے لگے ہو۔ میر کے اندازِ شکایت ہی کی طرز پہ اقبال نے بھی شکوہ میں شکوہ شکایت سے کام لیا ہے۔

پیشتر ہم سے کوئی تیرا طلبگار نہ تھا
ایک بھی نرگسِ بیمار کا بیمار نہ تھا
جنس اچھی تھی تری، لیک خریدار نہ تھا
ہم سوا کوئی ترا رونقِ بازار نہ تھا
کتنے سودائی جو تھے دل نہ لگا سکتے تھے
آنکھیں یوں موند کے وے جی نہ جلا سکتے تھے
(میر)

اب علامہ اقبال کی نظم ''شکوہ'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا
(شکوہ)

دونوں کی شاعری میں سہل ممتنع کی خصوصیات مشترک ہیں۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
غم کے جانے کا نہایت غم رہا
(میر)

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا
دل کی بستی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

دونوں کی شاعری میں زندگی کا فلسفہ ملتا ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
(میر)

اسی طرح موت کا فلسفہ بھی ملتا ہے:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
(میر)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

میر تقی میر بھی خود کو شاعر نہ کہنے کی بات کرتے ہیں اور اقبال کے ہاں بھی یہی بات ملتی ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
(میر)

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ
(اقبال)

تحصیل علم کے حوالے سے دونوں کے خیالات دیکھیے:

تحصیل علم کرنے سے دیکھا نہ کچھ حصول
میں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں
(میر)

پڑھ لیے میں نے علوم شرق وغرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب
(اقبال)

دونوں کے کلام میں احساس، انا، خودی اور خودداری کے پہلو ملتے ہیں

ہو جو منت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی
کاٹ اپنی رات کو خاروخس گلخن جلا
(میر)

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
(اقبال)

دونوں کے ہاں فلسفہ کائنات بھی اپنے اپنے انداز میں موجود ہے۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا
(میر)

حقیقت ایک ہے سب کی خاکی ہوں کہ نوری ہوں
لہو خورشید کا ٹپکے گا گر ذرے کا دل چیریں
(اقبال)

میر کی شاعری اپنے جذبات اور احساسات کی عکاسی کے لیے ہے، آشوب ذاتِ آشوب زیست اور آشوب شہر ان کی شاعری میں اپنا رنگ دکھاتا

ہے۔جب کہ اقبال کی شاعری صرف اپنی ذات اور اپنے جذبات کی عکاس نہیں ہے۔حرفِ آغاز کے عنوان سے ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں:

''میر کی شاعری جذبوں میں طوفان پیدا کر دیتی ہے...کلامِ میر جذبات واحساسات کی تطہیر کرتا ہے ...میر کی شاعری بہکی بہکی باتوں وارداتِ قلبی اور وجدانیت کی حامل ہے....اقبال فلسفی اور مفکر شاعر ہیں ۔۔اقبال کو ایک پیغام کی ترسیل کا فرض ادا کرنا ہے وہ شاعری کو شاعری کے طور پر نہیں آرٹ کے اظہار کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔''(۷)

میر کو ہر غم کو غمِ جاناں بنانے کا فن آتا ہے۔اقبال نے بھی اپنے غم کو غم کائنات بنایا ہے۔

دونوں کی شاعری میں تہذیبی زوال اور اقدار کے زوال کی تصویر کشی ملتی ہے۔دونوں زود حس ہیں۔دونوں زود گوئی کی طرف مائل ہیں۔دونوں کے ہاں فکری اور شعری گہرائی موجود ہے۔

میر کے ہاں بھی ہجر اور جدائی کی کسک ملتی ہے اور اقبال بھی وصل کے مقابلے میں ہجر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔دونوں عقل کے مقابلے میں جنوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
(میر)

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
(اقبال)

میر اور علامہ اقبال دونوں روحِ عصر سے آگاہ ہیں۔سیاسی وسماجی صورت حال وہنگاموں تیر وتلوار وخنجر کے کارناموں ، ورقوم کے حالات ،عصری فکر وخیال،لوگوں کے میلانات ورجحانات جس انداز میں کسی ادیب،شاعر، فلسفی،صوفی کے الفاظ وملفوظات میں ملتے ہیں وہ کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتے اور یہ قوم کے اجتماعی شعور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ڈاکٹر آفتاب احمد فرماتے ہیں،

میر کی تربیت انتہائی صوفیانہ ماحول میں ہوئی اور ان کی زندگی کے ابتدائی سال قلندروں اور درویشوں کی صحبت ہی میں گزری۔میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اس صحبت کے نتیجے میں میر خود بھی صوفی ہو گئے تھے،رہے تو وہ شاعر ہی مگر ان کے شعری مزاج کی تشکیل میں تصوف کا عمل دخل بہت رہا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں صوفیانہ تصورات کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی لے دام سے تا گوشِ گل آواز ہے ایک
گوش کو ہوش کے تک کھول کے سن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہیے جس شکل سے تمثال صفت اس میں درآ
عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

اقبال کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب احمد فرماتے ہیں کہ

اقبال بھی میر کی طرح تصوف کی گود میں پلے تھے۔ان کے والد بھی صاحب دل صوفی تھے۔ذاتی طور پر اقبال کو تمام عمر درویشوں، قلندروں اور صوفیانہ افکار واشغال سے شغف رہا۔شروع میں تو وہ وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن بعد میں ان کے خیالات میں ایک انقلاب آیا اور انھوں نے اس غیر اسلامی اور عجمی فلسفے سے اپنی وابستگی ترک کر دی اور اپنی شاعری کو ملت کی حیات نو کی خاطر عمل اور تگ ودو کا درس دینے کے لیے وقف کر دیا۔(۸)

وحدت الوجود کا فلسفہ اخذ وانجذاب کی بات کرتا ہے جب کہ وحدت الشہود کا فلسفہ تذکیہ اور تطہیر کی بات کرتا ہے بقول آفتاب احمد میر اور اقبال نے عالم گیر انسانی تصور اور اخوت ورواداری کو سمجھنے کے لیے ان فلسفوں سے کام لیا۔(۹)

اقبال نے میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا۔

داغ کے مرثیہ میں وہ لکھتے ہیں:

جوہر معجز نمائی پا چکا جس دم کمال
پھر نہ ہوسکتی تھی پیدا میر ومرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر
داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و دردِ میر

دونوں اپنے اپنے دور کے بڑے شاعر ہیں ان میں بے شمار مماثلتیں ہونے کے باوجود بہت سا اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ویسے تو ہر بڑے شاعر کا رنگ مختلف ہوتا ہے اسی لیے میر اور اقبال کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔دونوں کا اپنا اپنا انداز،افتادِ طبع اور اسلوب ہے۔دونوں کی شعری کائنات میں اپنے اپنے انداز اور تراکیب والفاظ کو برتنے کا لسانی نظام موجود ہے۔

اقبال مقصدی ادیب تھے جب کہ میر مقصدی نہیں تھے وہ شاعری کو ترجمانِ ذات اور ترجمانِ غم سمجھتے تھے۔

حوالہ جات: (۱) میر تقی میر کا مقام از علی اسرا (۲) آب حیات،لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۵۷ء،۲۱۰، ص۲۱۱ (۳) تقریظ کلیات اقبال از مولوی محمد عبدالستار نائب، کلیا تا قبال، ۱۹۲۵ء ، ص۵۹ (۴) نقوش، اقبال نمبر، نیرنگ خیال،ص۴۲۸ (۵) کلیات اقبال،مرتبہ عبدالرزاق،حیدرآباد دکن، عماد پریس،۱۹۲۵ء،ص۸۹ (۶) دیباچہ از علی سردار جعفری مشمولہ دیوان میر علی سردار جعفری۔میر شناسی کے چند پہلو rekhta.org (۷) احمد بختیار اشرف ڈاکٹر، میر، غالب اور اقبال: تقابلی مطالعہ، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء، ص۸ (۸) آفتاب احمد ڈاکٹر، میر غالب اور اقبال (تین صدیوں کے تین شاعر)، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء) (۹) ایضاً ص۱۶

⊙⊙⊙

سرسیّد - بے حجاب

محمد فاروق عزمی

''سرسیّد کے متعدد چہرے ہیں، ان کا ایک چہرہ مسلمانوں کی بہتری کی فکر رکھنے والا، ان کی تعلیم و ترقی کا خواہاں اور مصلح کا ہے۔ دوسرا، انگریزی حکومت کی اطاعت اور غلامی کا درس دینے والا اور ان کی تہذیب و تمدن کے گن گانے والا اور تیسرا مسلمانوں کے دینی عقائد میں خلجان پیدا کر کے گمراہ کن اور باطل عقائد کو فروغ دینے والا ہے۔''

مندرجہ بالا حوالہ سرسیّد احمد خان کے ان متضاد چہروں سے نقاب اُتارتی کتاب ''سرسید - بے حجاب'' سے ماخوذ ہے جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ اس تحقیقی اور علمی کتاب کے مصنف عظیم دانشور قانون دان، محقق، مذہبی سکالر، ردِّ قادیانیت اور تحفظِ ختمِ نبوّت کے بے باک مجاہد جسٹس (ر) میاں نذیر اختر قادری قلندری ہیں۔ اس کتاب میں سرسیّد احمد خان کی خدمات، افکار و نظریات اور دینی عقائد کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اور آزاد خیال افراد کا ایک طبقہ، بالخصوص ہماری نئی نسل جو سرسیّد کی حقیقت اور ان کی فکری لغزشوں سے آگاہ نہیں انہیں شاید کتاب کے نام ''سرسیّد - بے حجاب'' کو ہضم کرنا یا برداشت کرنا دشوار ہو لیکن محترم و فاضل مصنف نے بوجوہ، یہ نام درست اور بہت موزوں رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں قارئین اگر شخصیت پرستی اور جانب داری سے دامن بچا کر دلائل و شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے، حقیقت پسندی سے کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے تو وہ سرسیّد فہمی میں بہت آسانی سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ سرسیّد نے تاویلات کی آڑ میں اسلام کے اصل اور حقیقی چہرے کو مسخ کیا ہے، قرآنِ پاک کے آدم علیہ السّلام اور ابلیس کے حوالے سے بیان کردہ سچے واقعہ کو محض ایک غیر حقیقی اور تمثیلی کہانی قرار دے کر قرآنی آیات کے انکار کی جسارت کی۔ سرسیّد کی قرآنِ پاک کے 16 پاروں کی تفسیر کو ان کی نیچری سوچ کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے حضرت علامہ عبدالحق حقانی نے اسے تفسیرِ قرآن کے بجائے ''تخریبِ قرآن'' قرار دیا۔ اسی طرح کتاب ہٰذا کے بغور مطالعہ سے سرسیّد کی مبیّنہ علمی، معاشرتی اور سیاسی خدمات کی قلعی کھل جاتی ہے اور قاری، سرسیّد کی پروپیگنڈے کے زور سے قائم شخصیت کے سحر سے نکل جاتا ہے۔

احمد خاں متّقی (جو بعد ازاں سرسیّد احمد خان کے نام سے معروف ہوئے)، 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی کے ایک معزز شخص محمد متّقی کے گھر پیدا ہوئے۔ انہوں نے ریونیو کے قوانین اور عام دیوانی قانون کا مطالعہ کیا اور ان کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ انہوں نے اٹھارہ برس تک مکتب کی تعلیم پائی لیکن باقاعدہ دینی تعلیم حاصل نہیں کی۔ 1855ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی، 1867ء میں چھوٹے مقدمات کے لیے منصف مقرر ہوئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے وفادار اور انگریزوں کی جانیں بچانے میں فعّال کردار ادا کیا، مسلمانوں کی راسخ الاعتقاد طرزِ زندگی کو مسلمانوں کے لیے خطرہ قرار دیا، مغربی طرز کی سائنسی تعلیم اور مغربی تہذیب کے فروغ کے لیے علمی اور عملی جدّ و جہد کی، مسلمانوں کو سلطنتِ برطانیہ سے وفاداری کا درس دیتے ہوئے اسے ان کا دینی فریضہ قرار دیا۔ وہ مغربی تہذیب و تمدّن کے دلدادہ اور مشرقی تہذیب و افکار سے بے زار رہے۔ انہوں نے گردن مروڑی یعنی مردار مرغی کو اس بنا پر حلال قرار دیا کہ اہلِ کتاب کا کھانا، ازروئے قرآن، مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ اہلِ کتاب عیسائی تو سور کا گوشت کھاتے اور شرابیں پیتے ہیں۔ کیا یہ مسلمانوں کے لیے حلال ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اُصولی بات یہ ہے کہ کھانے پینے کی جن اشیا کو قرآنِ پاک میں حرام قرار دے دیا گیا ہے، وہ اس بنا پر حلال نہیں ہو جاتیں کہ اہلِ کتاب انہیں کھاتے پیتے ہیں۔ جیسے بہتا خون، مردار پرندے یا جانور اور سور کا گوشت۔ سرسیّد نے قرآنِ مجید کے 16 پاروں کی ایک نامکمل تفسیر اپنی نیچری سوچ اور عقل و دانش کے پیمانوں کے مطابق لکھی جس میں مسلمانوں کے چودہ صدیوں کے مسلمہ عقائد کی بیخ کنی کی گئی۔ انہوں نے ولیم میور کی کتاب دی لائف آف محمد کی ایک جلد کا جواب لکھا۔ بالعموم ان کی اس کاوش کو سراہا جاتا ہے لیکن اس میں بھی کئی باتیں درست نہیں ہیں، بالخصوص اسریٰ اور معراج النّبی ﷺ کو محض خواب قرار دینا۔ سرسیّد نے موجودہ دور کی بائیبل کو صحیح اور غیر مبدّل قرار دیا اور اس کی تفسیر تبیین الکلام لکھی۔ بائبل کو غیر مبدّل قرار دینا عامۃ المسلمین کے عقیدے کے خلاف ہے۔ ایک متحرک زندگی گزارنے کے بعد بالآخر سرسیّد کا وصال 27 مارچ 1898ء کو ہوا اور علی گڑھ میں ان کی تدفین ہوئی۔

جناب جسٹس (ریٹائرڈ) میاں نذیر اختر نے اپنی کتاب سرسید۔ بے حجاب کے آغاز میں سرسیّد کی بکھری ہوئی شخصیت کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔ ''سرسیّد احمد خان ماضی قریب کی ایک اہم، نامور مگر بڑی گنجلک شخصیت ہیں ان کی صحیح پہچان، نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وہ کبھی ایک مصلح، عصری تقاضوں سے آگاہ اور بھلے راہنما نظر آتے ہیں تو کبھی بے بصیرت، حیات کے حقیقی تقاضوں سے ناآشنا اور قدم قدم پہ رکیک ٹھوکریں کھانے والے مفکّر دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی بڑے محبِّ وطن اور ہندوستانی مسلمانوں کے دلی ہمدرد اور راہبر دکھائی دیتے ہیں اور کبھی انگریزی حکومت کے حامی بلکہ اس کے سچے خادم اور غلام نظر آتے ہیں، اسی طرح وہ غدّارانِ قوم میر جعفر اور میر صادق کی تعریفیں کرتے اور جنگِ آزادی کے مجاہدین کو گالیاں دے کر ایک پست سطح کے بے حمیت فرد، قوم دشمن اور بدیسی حکومت کے ایجنٹ نظر آتے ہیں''۔

مدّاحین سرسیّد کہتے ہیں کہ سرسیّد کی علمی، ادبی اور قومی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ انہوں نے علی گڑھ کالج کے قیام کے لیے جدوجہد کی، اردو زبان

CS CamScanner

کے فروغ اور حمایت کے لیے کوشاں رہے، کچھ رسالوں کا اجرا اور کئی مدارس کا قیام بھی ان کی خدمات کے زمرے میں آتا ہے، انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو جدید انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ لیکن ان ساری کوششوں کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز سلطنت کے لائق اور کارآمد بنانا تھا۔ کہنے کو تو سرسیّد کہتے تھے کہ ان کا مقصد حکومتِ برطانیہ کی غلامانہ اطاعت نہیں لیکن ان کے قول و عمل نے یہ ثابت کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی اطاعت اور دائمی غلامی کا درس دیا۔ انگریز کی اطاعت کے معاملے میں سرسیّد اور مرزا قادیانی کے خیالات و تصورات میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔ انگریز کے خود کاشتہ پودے "مرزا غلام قادیانی "نے اسلام کے بنیادی رکن جہاد فی سبیل اللہ سے انکار کیا، اپنے نہ ماننے والوں کو غلیظ گالیاں دیں۔ سرسیّد نے جنگِ آزادی 1857ء کے مجاہدین کو سوقیانہ گالیاں دیں اور میر جعفر اور میر صادق کی تعریفوں کے پل باندھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ "سرسید نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کو جاہل، بدمعاش، بے علم، حرام زادے، نمک حرام اور نامحمود قرار دیا۔ "یہ مضمون مئی 1994ء کے رسالہ ''ترجمان القرآن'' کے صفحہ 36 پر شائع ہوا۔ سرسیّد اور مرزا قادیانی دونوں جہاد بالسیف کے عقیدے کے خلاف تھے۔ جس طرح تفسیرِ قرآن سرسیّد کی آخری اور انتہائی متنازعہ تصنیف ہے، اسی طرح ان کے قابلِ اعتراض مذہبی عقائد ان کی شخصیت کو مسخ کرتے اور متنازعہ بناتے ہیں۔ ان کے مدّاح ان کی سرخ ترکی ٹوپی اور طویل ریشِ مبارک سے دھوکا کھا جاتے ہیں، پھر انہیں اپنے نام سرسیّد احمد خان کا بڑا سہارا تھا جسے سن کر یا پڑھ کر لوگ انہیں کوئی عالم یا مولانا سمجھ بیٹھتے۔ سرسیّد اسلام کے مسلمہ عقائد کے منکر اور مذہب بے زار شخص تھے۔ ان کے مذہبی افکار اور دینی عقائد کو سامنے رکھیں تو افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ سے دشمنی کی بلکہ مسلمانوں کو بھی باطل عقائد، غلط تفسیری تشریحات عقل پرستی اور علم کلام کے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا۔ سرسید نے اسلام کے صدیوں کے مسلمہ عقائد اور تفسیری افکار میں نقب لگائی، اپنے گمراہ کن، نیچری اور عقلی عقائدہ تشریحات اور باطل تفسیری تعبیرات پیش کر کے مسلمانوں میں خلجان پیدا کیا۔ صحیح اسلامی عقائد کے برعکس انہوں نے ملائکہ، ابلیس اور جنات کے وجود کا انکار کیا۔ جبرائیل علیہ السلام کے وحی لانے، انبیا علیہم السلام کے معجزات، اولیاء اللہ کی کرامات اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جسمانی اسرا و معراج کا بھی انکار کر دیا۔ جنت دوزخ، سزا جزا اور عذاب قبر کے بھی منکر ہو گئے۔

کتاب ''سرسیّد۔ بے حجاب'' کے مصنف جسٹس (ر) میاں نذیر اختر قانون دان، دینی سکالر، خطیب، شاعر، مورخ، حکیم اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ تحفظِ ختم نبوّت اور ناموسِ رسالت کے دلیر اور بے باک مجاہد ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ اسلام کی سربلندی، جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنا، اور قوم کی اصلاح آپ کی زندگی کا نصب العین ہے۔ زیرِ تذکرہ کتاب میں آپ بلند پایہ محقق کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ تحقیق جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس سفر میں کٹھن گھاٹیاں سر کرنا پڑتی ہے دشوار راستوں کا یہ سفر کسی ہما شما کا کام نہیں۔ سرسیّد کا اصل چہرہ دکھانے کی جستجو میں انہیں ایک طویل عرصہ تحقیق کے میدان میں سرگرم اور مصروف رہنا پڑا آپ نے 90 سے زائد کتابوں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا۔ اپنی کتاب کے آخر میں کتابیات کے عنوان سے ان تمام کتابوں کے نام مصنفین، مترجمین اور مفسّرین کے نام، ناشران کے نام اور پتے بھی درج کر دیئے ہیں جن سے انہوں نے استفادہ کیا۔ اس بہت اہم اور تحقیقی و علمی کتاب کے بارے میں جن عظیم اور علمی شخصیات نے اپنی آرا اور تقاریظ لکھی ہیں ان میں جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب جو تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان کے صدر ہیں، جناب ملک محبوب الرّسول قادری اہم دینی، علمی ادبی و روحانی شخصیت، پروفیسر احمد علی شاکر اور پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین آزاد کے نام شامل ہیں۔ پروفیسر صاحبان بھی ملک کی اہم علمی، ادبی اور تحقیقی شخصیات میں شامل ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان جناب مفتی منیب الرحمٰن اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "محترم جسٹس میاں نذیر اختر نے اس کتاب میں سرسیّد کا علمی اور فکری تعاقب کیا ہے، سرسیّد کی زندگی کے مختلف گوشوں اور فکری لغزشوں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کے عقائدِ باطلہ کو بیان کرنے کے بعد ان کا رد کیا ہے۔ ملک محبوب الرّسول قادری لکھتے ہیں۔ سرسیّد نے تاویلات کی آڑ میں اسلام کا چہرہ مسخ کیا ہے۔ مکتب سرسیّد میں جہاد کا انکار، معجزات کا انکار، فرشتوں کا انکار، وجودِ جنّات کا انکار، جنّت اور دوزخ کا انکار، معجزہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تشکیک کی کوشش، یہ کون سے اسلام کی خدمات ہیں اور ان خدمات کی حیثیت کیا ہے؟۔

الغرض جناب میاں نذیر اختر صاحب زید شرفہ کی اس محققانہ کاوش کا مقصد سرسیّد کے مداحین کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا اور ان کے چہرے پر پڑے حجابوں کو ہٹا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ سرسیّد مرحوم یورپی تہذیب سے مرعوب ہو کر مغربی افکار کے سامنے سرنڈر کر گئے تھے۔ لیکن سرسیّد کے آزاد خیال مداحوں نے ان کی تعریفوں کے پل باندھے اور انہیں ایک عظیم مصلح اور مفکّر ظاہر کیا جبکہ وہ قدم قدم پر رکیک ٹھوکریں کھانے والے، غدّارانِ وطن میر جعفر اور میر صادق کے گُن گانے والے، جنگِ آزادی کے مجاہدین کو گالیاں دینے والے اور مسلمانوں کے چودہ صدیوں کے مسلمہ عقائد کا انکار کر کے مسلمانوں میں فکری خلجان اور ذہنی اضطراب پیدا کرنے والے، کانگریس کے نظریۂ قومیت کے حامی، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم سمجھنے والے، انگریزی حکومت کے سچے خادم اور غلام تھے۔ انہوں نے کبھی انگریزی حکومت یا ہندوؤں کے غلبے سے نجات حاصل کر کے ایک الگ مسلم ریاست کا نظریہ پیش نہیں کیا۔ یہی ان کا اصل چہرہ ہے۔ جسے کتاب ہذا میں بطریقِ احسن بے حجاب کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ کیسے لگا؟

ظفر سیّد/ اسلام آباد

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شاید نظم شکوہ کے بعد اقبال پر کفر کا فتویٰ لگا تھا مگر یہ کچھ اور معاملہ تھا اور اس کا ہدف اقبال نہیں بلکہ کوئی اور تھے۔

15 اکتوبر 1925 کی بات ہے کہ اس زمانے کے مشہور اخبار زمیندار کے پہلے صفحے پر ایک ایسی سنسنی خیز خبر شائع ہوئی جس نے پڑھنے والوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

یہ ایک فتویٰ تھا جسے لاہور کی مسجد وزیر خان کے خطیب مولوی دیدار علی الوری نے جاری کیا تھا۔ مولوی دیدار مشہور و معروف عالمِ دین اور مفتی تھے، اور ان کا فتوے دینا عام بات تھی۔ مولوی صاحب نے اپنی زندگی میں شاید سینکڑوں فتوے جاری کیے ہوں گے لیکن شاید انہیں اس وقت گمان تک نہ ہوگا کہ ان کے اس فتوے کی دھمک ایک صدی بعد بھی سنائی دے گی۔

یہ فتویٰ علامہ اقبال کے بارے میں تھا۔ وہ اقبال جو اس وقت نہ صرف برصغیر کے اردو فارسی ادبی منظرنامے پر ہمالیہ کی طرح چھائے ہوئے تھے، بلکہ ان کا چرچا افغانستان، ایران اور ترکی کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی ہو رہا تھا۔ خسرو، کبیر، وارث شاہ اور ٹیگور کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہو جسے پچھلے ہزار برسوں میں ہندوستان کے طول و عرض میں عوام و خواص دونوں کی طرف سے ایسا والہانہ قبولِ عام ملا ہو، اس لیے اس فتوے پر اتنا شدید ردِعمل آیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر اقبال بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟

تفصیل بعد میں آئے گی، پہلے فتویٰ پڑھ لیجیے:

اسم پروردگار اور یزدان عرفان مخصوص جناب باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں۔ اندریں صورت یزدان اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ہذا، خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہینِ موسیٰ اور توہینِ بزرگانِ دین، فق لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکور توبہ نہ کرے اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں، ورنہ سخت گناہ گار ہوں گے۔

محمد دیدار علی، خطیب مسجد وزیر خان لاہور

جن لوگوں کو مولوی صاحب کی اردو کے گاڑھا ہونے کی شکایت ہو ان کے لیے سلیس اردو میں عرض ہے (یہ الگ بات کہ لفظ سلیس خود گاڑھا ہو چکا ہے!) مولوی صاحب فرما رہے ہیں کہ مندرجہ ذیل چیزیں کفر ہیں:

* لفظ پروردگار اور یزدان صرف خدا کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اس لیے سورج کو پروردگار یا یزدان کہنا
* یہ کہنا کہ خدا نے جنم لیا ہے
* موسیٰ علیہ السلام یا دوسرے بزرگانِ دین کی توہین

اب سوال یہ بنتے ہیں کہ کیا اقبال نے واقعی یہ تینوں مذکورہ کام کیے ہیں اور اگر کیے ہیں تو کیا اس پر کفر کا فتویٰ لگ سکتا ہے اور مزید یہ کہ مولوی دیدار کے جاری کردہ فتوے کا پس منظر کیا تھا؟

جیسا کہ دنیا میں عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے، معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے اور اس کی کئی پرتیں ہیں جنہیں ہم کھولنے کی کوشش کریں گے۔

اصل میں مولوی صاحب نے براہِ راست اقبال کے کلام سے یہ قابلِ اعتراض نکتے دریافت نہیں کیے تھے، بلکہ انہیں ایک خط موصول ہوا تھا جس میں ان کی رائے پوچھی گئی تھی۔

وہ خط یہ ہے: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور امین شرح متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مراد طلب کرے اور آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر پر استہزا کرے، علمائے کرام اور پیرانِ عظام پر آوازے کسے اور انہیں برے خطابات سے یاد کرے، ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں، امام اور چراغِ ہدایت کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو؟

کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین نشست و برخاست اور ہر طرح طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟

اس کے بعد اس خط میں اقبال کے کچھ اشعار بھی پیش کیے گئے تھے جن میں اوپر دیے گئے متنازع نکات موجود ہیں:

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

....

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

....

غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر ترے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

....

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کا امامِ ہند

مولوی دیدار نے اسی خط کے جواب میں فتویٰ لکھا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ فتویٰ صرف زمیندار اخبار میں شائع ہوا اور مولوی صاحب نے خود اس کی تشہیر نہیں کی تھی۔

مولوی صاحب جو اعتراضات کیے ان پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔ آفتاب والے اشعار (ہم نے اختصار کی غرض سے ایک ہی شعر دیا ہے مگر خط میں چار شعر ہیں) اقبال کی نظم آفتابِ صبح، سے لیے گئے ہیں جو ان کی کتاب بانگِ درا میں شامل ہے۔

یہ اقبال کی طبع زاد نظم نہیں بلکہ دراصل رگ وید کی ایک سنسکرت دعائیہ نظم کا ترجمہ ہے۔ یہ اقبال کے ابتدائی دور کی نظموں میں شامل ہے اور سب سے پہلے 1903 میں ایک رسالے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔

اس وقت اس کے ساتھ ایک نوٹ بھی شامل تھا کہ ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں۔۔۔ اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے۔

آسان زبان میں جس سورج کی اس نظم میں بات ہو رہی ہے وہ آسمان پر چمکنے والا سورج نہیں بلکہ نیکی اور بھلائی کی علامت ہے جس سے سورج بھی استفادہ کرتا ہے اور بقیہ کائنات بھی۔ اسلام میں بھی خدا کو کائنات کا نور کہا گیا ہے، اس لیے یہ خیال بہت زیادہ قابلِ گرفت نہیں۔

لیکن اتفاق سے جب یہ نظم بانگِ درا میں شامل کی گئی تو یہ تمہید کسی وجہ سے حذف کر دی گئی۔

مزید یہ کہ مولوی دیدار نے فتوے میں لکھا ہے کہ یزداں اور پروردگار صرف ذاتِ جنابِ باری یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں، مگر شاید انہوں نے غور نہیں کیا کہ یہ الفاظ عربی کے نہیں بلکہ فارسی زبان کے ہیں۔ یزداں پارسی مذہب میں استعمال ہوتا رہا ہے جب کہ پروردگار تو ایک قسم کی شراب کو بھی کہتے ہیں۔

اقبال کی احتیاط کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس نظم میں عربی کی بجائے فارسی الفاظ زیادہ برتے ہیں تا کہ یہ نظم اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہو سکے۔

جہاں تک دوسرے اشعار کی بات ہے تو اگر ایسے شعروں پر فتوے لگتے رہے تو پھر کوئی اردو فارسی شاعر کفر سے بچ نہیں سکے گا، بلکہ اس لپیٹے میں بہت سے صوفی بزرگ بھی آ جائیں گے۔ امیر خسرو، مولانا رومی، حافظ شیرازی، بیدل، میر، غالب وغیرہ کے ہاں ایسے قابلِ فتویٰ شعر تھوک کے حساب سے مل جاتے ہیں۔

عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ذکرِ اقبال میں لکھا ہے کہ اس فتوے پر ملک بھر میں شور مچ گیا۔ مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی۔ مولانا سلیمان ندوی نے زمیندار میں اس جاہلانہ فتوے کی چھتاڑ کر دی۔۔۔ ایک گمنام مقالہ نگار نے ایک مدلل مضمون میں اس فتوے کا جواب دیا، یعنی اشعارِ منقولہ کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے ثابت کیا کہ ان سے ہرگز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔

عبدالمجید سالک مزید لکھتے ہیں کہ مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا کیوں کہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عام، قدیم، تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان، عاشقِ رسول، دردمندِ ملت، حامیِ دینِ اسلام تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمارے علما کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟

اس کے علاوہ حکیم احمد علی فیروز پوری نے بھی زمیندار میں مولوی صاحب کے خلاف مضامین لکھ کر ان کے فتوے پر کڑی گرفت کی۔ جن صاحب کو سالک نے گمنام مقالہ نگار کہا ہے، دوسری کتابوں میں ان کا نام چوہدری محمد حسین (ایم اے) لکھا ہے۔ انہوں نے اور حکیم فیروز پوری صاحب نے تو الٹا یہ سوال اٹھا دیا کہ کیا اس فتوے کے بعد خود مولوی صاحب خود مسلمان رہے یا نہیں؟

مولوی دیدار کون تھے؟

مولوی دیدار کوئی چھوٹی موٹی شخصیت نہیں بلکہ اپنے دور کے نہایت مشہور و معروف عالمِ دین تھے جن کا تعلق بریلوی مسلک سے تھا اور ان کو براہِ راست احمد رضا خاں بریلوی سے شاگردی اور رہنمائی کا شرف حاصل تھا۔

ضیائے طیبہ نامی ویب سائٹ کے مطابق وہ 1852 کو الور میں پیدا ہوئے تھے۔ دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1907 میں لاہور آ کر یہاں قوت الاسلام کے نام سے مدرسہ قائم کیا۔ 1922 میں مسجد وزیر خاں کے خطیب مقرر ہوئے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا انتقال 1935 میں، یعنی اقبال کے رحلت سے تین سال قبل ہوا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا، مولوی صاحب کفر کے فتوے دینے میں تیز تھے۔ اقبال سے پہلے مشہور کانگریسی رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے علاوہ

زمیندار کے مدیر مولانا ظفر علی خاں کے خلاف بھی ایک شعر کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ دے چکے تھے۔

مولوی دیدار کو پھانسا گیا تھا؟

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ معاملہ دو جمع دو چار نہیں کہ مولوی دیدار نے اقبال کے شعر دیکھے اور فتویٰ جڑ دیا۔ زمیندار کے اسی شمارے میں جو تفصیل چھپی ہے اس سے ایک اور کہانی سامنے آتی ہے۔ مولوی دیدار تک یہ شعر کیسے پہنچے تھے، اس کے بارے میں لکھا ہے:

مولوی دیدار کے حد سے بڑھے شوقِ تکفیر کو دیکھ کر ایک زندہ دل اور خوش طبع مسلمان نوجوان نے جو پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری کے نام سے موسوم ہونا پسند کرتے ہیں، مولوی دیدار کے پاس حسبِ ذیل استفتا (سوالنامہ) بھیجا، جس پر مولوی دیدار علی صاحب نے بےتکلف علامہ اقبال ایسے ترجمانِ حقیقت اور لسانِ اسلام کے کافر اور فاسق ہونے کا فتویٰ دے دیا اور ان سے ملنے جلنے والوں کو سخت گنہگار قرار دے دیا ہے۔

یہ سوالنامہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں جس میں مولوی دیدار سے اقبال کے شعر لکھ کر ان کے بارے میں رائے طلب کی گئی تھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس سوالنامے میں شاعر کا نام درج نہیں ہے، اس لیے گمان یہی ہے کہ مولوی دیدار نے شاعر کا نام جانے بغیر ہی فتویٰ لکھ دیا۔

اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ خوش طبع سائل پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری کون تھے جس نے مولوی صاحب سے فتویٰ طلب کیا تھا؟

اقبال کے مستند سوانح نگار خرم علی شفیق لکھتے ہیں کہ ان دنوں زمیندار کے مدیر مولانا ظفر علی خاں اور نائب مدیر غلام رسول مہر دونوں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے، اور اخبار کی ادارت کی ذمہ داری نوجوان ادیب عبدالمجید سالک کے کندھوں پر آ گئی تھی۔ خرم علی شفیق کے مطابق سالک نے مولوی صاحب کو شرمندہ کرنے کے لیے اس طرح ان سے فتویٰ لیا کہ ایک فرضی نام سے سوال بھجوایا گیا، سوال میں علامہ کا نام نہیں لیا گیا۔ علامہ کے مشہور ترین اشعار کی بجائے بعض ایسے اشعار لکھے جو صرف کتابوں اور رسالوں میں شائع ہوئے تھے، جلسوں میں نہیں پڑھے گئے تھے۔

شفیق مزید لکھتے ہیں کہ فتویٰ حاصل کر کے اس لیے شائع کیا گیا کہ علامہ اقبال اس وقت ہندوستان کے اُن چند مسلمانوں میں سے تھے جن کے خلاف کفر کے فتوے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک مولوی دیدار سے سوال پوچھنے والے پیرزادہ کا تعلق ہے تو گمان غالب ہے کہ وہ عبدالمجید سالک خود ہی تھے۔

کیا صرف عبدالمجید سالک ہی ذمہ دار تھے؟

لیکن ہمارا سوال ہے کہ کیا سارا ملبہ سالک پر ڈالنا مناسب ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ زمیندار نے بطور ادارہ ہی مولوی صاحب کو ہدف بنانے کی سازش کی ہو؟ آخر مولوی صاحب نے زمیندار کے مالک اور مدیر مولانا ظفر علی خاں پر بھی فتویٰ لگایا تھا اور مولانا نے ان کی ہجو بھی لکھی تھی۔

(لوگوں کی دل آزاری کے خدشے کے پیشِ نظر ہم وہ ہجو یہاں نقل نہیں کر سکتے، البتہ کسی کو شوق ہو تو وہ خرم علی شفیق کی کتاب اقبال: دورِ عروج کے صفحہ 328 پر پڑھ سکتا ہے۔)

اس لیے ہم یہ مفروضہ پیش کر سکتے ہیں کہ شاید زمیندار نے بطور ادارہ مولوی صاحب کو نیچا دکھانے کا منصوبہ بنایا، اور جس وقت اس منصوبے پر عمل درآمد ہوا عین اسی وقت ادارے کے مدیر اور نائب مدیر پراسرار بلکہ مشکوک طور پر ملک سے باہر چلے گئے تھے تاکہ ان پر حرف نہ آئے۔

مزید یہ کہ اس قسم کے منصوبے کے لیے خاصی طویل منصوبہ بندی درکار ہوتی ہے، اس لیے یہ بات قرینِ قیاس نہیں لگتی کہ ایک نوجوان مدیر، جو عارضی طور پر اخبار کی ادارت سنبھالے ہوئے ہے، ادارے کی آشیرباد کے بغیر خود اپنے طور پر اتنا بڑا منصوبہ بنائے اور جلدی جلدی اس پر عمل بھی کر گزرے۔

زرد صحافت؟

زمیندار نے بطور ادارہ جو کچھ کیا اس سے ایک تیر سے دو شکار کرے۔ مولوی دیدار تو نشانہ تھے ہی، لیکن اتنی تہلکہ خیز اور دھماکہ دار خبر چھاپنے کے بعد یقیناً اخبار کی اشاعت میں زبردست اضافہ دیکھنے میں آیا ہوگا۔ اخبار میں چھپنے والے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ یہ معاملہ ہفتوں بلکہ مہینوں گرم رہا تھا۔

اب معاملہ یہ ہے کہ اگر خرم علی شفیق کا نظریہ درست ہے تو پھر زمیندار نے خبر چلائی نہیں بلکہ خبر بنائی اور اس کے لیے مولوی دیدار کے علاوہ علامہ اقبال کو بھی استعمال کیا گیا۔ مولوی صاحب کو نیچا دکھانے کی کوشش میں اور اپنے اخبار کی مقبولیت بڑھانے کے لیے اقبال پر کفر کے مصنوعی فتوے سے ظاہر ہے کہ اقبال کو بھی شدید ذہنی دھچکہ پہنچا ہوگا۔ انہوں نے ایک خط میں بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ مجھ پر تو کفر کے فتوے لگ رہے ہیں۔

البتہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا مولوی دیدار کی جلد بازی اور تکفیر کی عادت نے انہیں نقصان پہنچایا اور زمیندار نے ان کے خلاف جو پھندا تیار کیا وہ بیدھڑک اس میں پھنس گئے۔

احمد ندیم رفیع کی شاعری سے انتخاب

حسن عباسی/لاہور

دو گھڑی آؤ کہ ملنے کا تردد کر لیں
ڈھل نہ جائے کہیں مہتاب شناسائی کا

ہم آشنائے حرف و معانی نہ تھے مگر
حسنِ خیال یار نے شاعر بنا دیا

اُس نے آخر سمیٹ لی باہیں
ہم گرفتارِ پیش و پس ہی رہے

کیسی بہار آئی ہے اب کے دیار میں
بادِ صبا خفا ہے تو خوشبو گریز پا

سنبھالتا ہے وہ آنچل مگر تکلف سے
وہ اپنے حُسن سے آگاہ بھی ہے غافل بھی

تو بھی نہ کہیں ساتھ مرا چھوڑ گیا ہو
اس ڈر سے کبھی میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا

پنہ گزین ہوں نسیاں کے سائبان تلے
ترے خیال کی بارش میں بھیگتا کب تک

اس زمیں پر اُداس میں بھی ہوں
اُس طرف عرش پر خدا تنہا

عشقِ لیلائی نے کی ہو گی بغاوت ورنہ
دشت میں قیس کے مرنے کی خبر، کیا معنی

کھڑے ہیں بھیس بدل کر تماشہ گاہ میں سب
کریں تو کس کا کریں اعتبار آئینے

کم مائیگی پہ اپنی ، قیامت تھی شرمسار
ڈھانکا ہوا تھا پیرہنِ یار اک طرف

ٹھہری تھی آ کے تیرے مقابل میں زندگی
اور پھر کسی حسین تصور میں کھو گئی

شہرِ بے صوت میں جینا ہے ندیم
ہر نفس موجِ ساعت ہی سہی

جو مجھے غیر سمجھتے ہیں تری محفل میں
وہ ترے حلقۂ احباب سے ناواقف ہیں

تجھے چھوتا نہیں بس دیکھتا ہوں
کہ شہرِ خواب میں تو ڈر نہ جائے

اس رُخِ زیبا کی سج دھج میں کمی کیا رہ گئی
مجھ کو اپنی زندگی کی ہر کمی اچھی لگی

بے خبر رکھتا ہے دن بھر چلچلاتی دھوپ سے
مجھ میں ہے آسیب کوئی سایۂ دیوار کا

وہی بیٹھا تھا میرے پہلو میں
جس نے باہر سے دی صدا مجھ کو

دھوپ جب نکلی تری زلفوں کی چادر تان لی
شب ڈھلی تو تیری آنکھوں کو ستارہ کر لیا

ابھی ظاہر اور ابھی پنہاں
رگِ فطرت ہے رمِ غزالاں کا

ہنوز رقص کناں ہے میانِ ہست و بود
شبِ وصال کا ہر پل گریز پا نکلا

بھٹک رہے تھے غلط فہمیوں کی غار میں ہم
چٹان شک کی ہٹائی تو راستہ نکلا

تھامے کھڑا ہوں جاتی ہوئی ساعتوں کی ڈور
ہر چند اختیار میں اب کوئی بھی نہیں

تجھ سے ملنے میں ہے یہی مشکل
فاصلہ ہے مگر ذرا سا ہے

یہ سناٹا مرے اعصاب پر طاری نہیں ہوتا
میں جب بھی سانس لیتا ہوں تری آواز آتی ہے

تسخیرِ کائنات کا ہے سلسلہ طویل
فرصت ملے تو ذات کا حیرت کدہ بھی دیکھ

عدم آباد کے دریچوں سے
روح میں جھانکتی ہے تنہائی

وہ شخص یوں تو ملا تھا کئی دہائیوں بعد
سجا ہوا تھا وہی مے کدہ سرِ مژگاں

جب بھی اُنھیں جھکی ہوئی پلکیں
وسعتِ دو جہاں سمجھ آئی

جو ترے لب پہ آ گئی وہ بات
گفتگو کا اصول کہلائی

اتنی جلدی تھی اُسے جانے کی
کفِ افسوس بھی ملنے نہ دیا

حسبِ معمول رہے شام و سحر تیرے بعد
چاند بھی یونہی رہا محوِ سفر تیرے بعد

کم نصیبی میں بھی اوقات سے بڑھ کر پایا
سوچتا ہوں کہ ترا دستِ کرم کیا ہوگا

CamScanner

سجاد راکب/احمد پور شرقیہ

بارش میں اُس حسین کا آنا ٹھہر گیا
گردش کے زعم میں تھا زمانہ ٹھہر گیا
وہ چل پڑا تو ارض وسما ساتھ چل پڑے
ٹھہرا تو روز و شب کا فسانہ ٹھہر گیا
مجھ پر فلک سے داد اُترنے کا سلسلہ
ذرّے کو آفتاب بنانا ٹھہر گیا
اُس شہرِ بے لباس میں اک بالباس تھا
کل وہ بھی پتھروں کا نشانہ ٹھہر گیا
خوشبو کے ساتھ رنگ بھی بکھریں گے ہر طرف
گُل کا صبا سے ہاتھ ملانا ٹھہر گیا
راکبؔ یہ اختتامِ سفر پر کسی سے عشق
بارش میں خود کو آگ لگانا ٹھہر گیا

اگر منزل سے کچھ پہلے ترا دیدار ہو جائے
ہمارے راستوں کی دھول تک گلنار ہو جائے
سمجھ لینا کسی کا ہاتھ ہوگا میرے شانے پر
اگر کاغذ کی ناؤ سے سمندر پار ہو جائے
شرارت سے بھری اب میرے بچپن کی کہانی پر
کسی اُڑتے غبارے کا بھی کچھ اظہار ہو جائے
مجھے اس شہر میں چاروں طرف سے خوف آتا ہے
جہاں کم ظرف کوئی صاحبِ دستار ہو جائے
کوئی تہوار تو آئے یہاں مہندی لگانے کا
یہ صحرا دھوپ کا پل بھر میں لالہ زار ہو جائے
اگر ہم بولتے سورج کو راکبؔ رہنما کر لیں
ہماری شاعری کا اور ہی معیار ہو جائے

موسمِ گل میں پرندے چہچہا کر پیار میں
گھونسلے اپنے بناتے ہیں مری دیوار میں
میں ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے بعد بھی
شہرتوں کی سیڑھیاں چڑھتا رہا مینار میں
اک تری چارہ گری کے خالی کاغذ کے سوا
ہر زمانے کا فسانہ ہے مرے اشعار میں
آپ بس سر سے کفن کو باندھ لیں پھر دیکھیے
منزلیں ہی منزلیں ہوں گی رہِ دشوار میں
آئینہ خانے میں پتھر پھینکنے سے کم نہیں
اس پری کا چوڑیاں رکھنا مری دستار میں
محفلوں کے ساتھ راکبؔ شاعری بھی چھوڑ دی
زندگی نے مجھ کو آخر چن دیا دیوار میں

ہر ستارہ جھانکتا تھا پردۂ افلاک سے
رات جب جگنو اُڑے میرے گریباں چاک سے
آئینوں کے شہر میں کوئی اُٹھا کر لے گیا
تیری ہر تصویر میرے گوشۂ ادراک سے
ہاتھ خالی ہو گئے خیرات جاری ہے ابھی
لوگ گوہر نوچ لیں آ کر مری پوشاک سے
آئینہ میں بھی دکھا سکتا ہوں سورج کو مگر
دوبدو ہونا پڑے گا فطرتِ بے باک سے
چاند بھی اب داد دیتا ہے مرے اشعار پر
آسماں بھی مطمئن لگتا ہے میری خاک سے
کیا خبر راکبؔ ہوا کے ساتھ صحرا کا سفر
نیلگوں آنکھیں مری بھر دے خس و خاشاک سے

زمیں پہ آن گرا آسماں پہ چلتے ہوئے
غروب ہو گیا سورج بھی ہاتھ ملتے ہوئے
اندھیری رات کے منظر کا یہ تقاضا ہے
ہوا کو آگ لگا دیں چراغ جلتے ہوئے
میں جانتا ہوں انہیں شہرِ سنگ میں جن کی
تمام عمر لگی آئینوں میں ڈھلتے ہوئے
ادب میں اتنا تعارف ہے میری قامت کا
غزل سناتے ہیں احباب اب سنبھلتے ہوئے
تمام نقش پرندوں کے ہو گئے معدوم
سہانے دور کی تصویر سے نکلتے ہوئے
وہ چل دیا تو قیامت ہی آ گئی راکبؔ
زمیں پہ گرنے لگا آسماں پگھلتے ہوئے

ہر ایک شخص مجھے دیکھنے لگا سائیں
میں تیرے لمس سے آئینہ ہو گیا سائیں
ہمارے شہر کے دریا کا خشک چہرہ پڑھ
یہاں سے چلتا ہے صحرا کا سلسلہ سائیں
قلم سے خون ٹپکتا ہے آنکھ سے آنسو
مگر میں لکھ کے رہوں گا یہ واقعہ سائیں
دعا کرو اُسے خوشیاں قدم قدم پہ ملیں
وہ مجھ کو چھوڑ گیا ہے تو کیا ہوا سائیں
کبھی تو شہر میں اس کے یہ دیکھنے جائیں
حسین کیسے ہیں کیسے ہیں بے وفا سائیں
تو آسمان کو چل یا دیارِ راکبؔ میں
میں تیرے ساتھ ہوں جیسا ہو راستہ سائیں

کامران ناشط/لاہور

زندگی بھر وصل کی حسرت لیے بیٹھے رہے
خواب میری آنکھ میں، تعبیر اُس کی آنکھ میں

آخرش تعبیر کے اسباب ہجرت کر گئے
دھیرے دھیرے آنکھ سے سب خواب ہجرت کر گئے
اپنے اپنے راستے تھے ، اپنی اپنی منزلیں
ہم اکیلے رہ گئے احباب ہجرت کر گئے
آس جن کی پالتے تھے دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ
سب سہارے اے دلِ بے تاب ہجرت کر گئے
اے غمو! وہ زندگی بھر ساتھ چلنا کیا ہوا
اے غمو! تم ساعتِ ایجاب ہجرت کر گئے
اک تیقن اوڑھ کر ہم جس طرف بھی چل دیے
گردشیں ٹلتی رہیں ، گرداب ہجرت کر گئے
ہر مغنی دے نہیں سکتا انہیں ناشط قرار
تار بجتے رہ گئے مضراب ہجرت کر گئے

ہر ناخدا کو چھوڑا ، خدا کے سپرد کیں
دل کی تمام باتیں دعا کے سپرد کیں
یہ بے خودی ، یہ خواہشیں ، یہ رائیگانیاں
میں سو رہا تھا مجھ کو جگا کے سپرد کیں
یا رنگ تھے یا خوشبوئیں یا روشنی تھی پاس
جو جو امانتیں تھیں ہوا کے سپرد کیں
ایسا نہیں کہ ہم کو نوازا نہیں گیا
جتنی محبتیں تھیں انا کے سپرد کیں
دینے کو کچھ نہیں تھا بنامِ خدا بچا
خالی ہتھیلیاں ہی گدا کے سپرد کیں

خدا جانے نظامِ زندگی کیسے چلاتا ہوں
میں شوقِ گل فروشی میں فقط خوشبو کماتا ہوں
اسی کارِ مسلسل میں یہ روز و شب گزرتے ہیں
وہ مجھ کو توڑ دیتا ہے میں خود کو پھر بناتا ہوں
مجھے عشق و محبت کے سبھی آداب آتے ہیں
دلِ کم ظرف روٹھے تو گلے لگ کے مناتا ہوں
نہ جانے کیوں یہ تاریکی مجھے اب راس آتی ہے
یہ جتنی بڑھتی جاتی ہے میں اُتنا جگمگاتا ہوں
طبیعت میں تغیر پر مجھے خود بھی تحیر ہے
کبھی پتھر دلی طاری کبھی آنسو بہاتا ہوں
میں پیشہ ور بھکاری ہوں میں گھر کو آ بھی جاؤں تو
کسی بازار میں اپنی ہتھیلی چھوڑ آتا ہوں
یہ دن بھر در بدر ناشط جو خواہش چھو نہیں سکتا
میں شب کی بالکونی سے اُسے گھر میں بلاتا ہوں

بے سرو سامان تھا ، پھر بھی ٹھکانہ بن گیا
تنکا تنکا جوڑنے سے آشیانہ بن گیا
تجھ سے پہلے واجبی تھا ، جب تجھے سوچا کیے
رات کا ماحول بالکل شاعرانہ بن گیا
آسماں نے دے دیا اُس کو نہ آنے کا جواز
چند بوندیں کیا گریں اُس کا بہانہ بن گیا
رات دن پیروں سے ایسے گردشیں لپٹی رہیں
دشت و دریا سے ہمارا دوستانہ بن گیا
پھر مؤرخ نے کہیں خود سے روایت ڈال دی
پھر کسی سچی کہانی کا فسانہ بن گیا

دلوں کو توڑ دینے کی روایت ایک جیسی ہے
کسی خطے سے ہو آئیں محبت ایک جیسی ہے
یہ بوندیں بھی تجھے چھونے کی چاہت لے کے آئی ہیں
ہماری اور گھٹاؤں کی مسافت ایک جیسی ہے
ترے سادہ سے چہرے میں یہ کیسے بھید رکھے ہیں
کئی مطلب بدلتے ہیں عبارت ایک جیسی ہے
دلِ سادہ یہاں سب نے تجھے دھوکے میں رکھا ہے
دلِ سادہ یہاں سب کی دیانت ایک جیسی ہے
مرے جذبے تری حسرت کے پہلو میں مرے ناشط
تو گویا آج دونوں کی شہادت ایک جیسی ہے

لو یہ معاملہ بھی سنبھالا نہ جا سکا
سکہ ہوا کے رُخ پہ اُچھالا نہ جا سکا
احباب ہر خوشی کو بدلتے تھے غم کے ساتھ
ہم سے کہا کسی کا بھی ٹالا نہ جا سکا
مشکل یہ آ پڑی ہے کہ کوشش کے باوجود
رستہ ترے لیے بھی نکالا نہ جا سکا
اُس سے نبھا سکے نہ تعلق کچھ اس لیے
سادہ مزاج شوخی میں ڈھالا نہ جا سکا
ناشط کسے خبر ہے کہ کل سے پڑوس میں
بچوں کے منہ میں کوئی نوالہ نہ جا سکا

نام کی خواہش لیے بے نام جذبے آپ کے
کب محبت میں ڈھلیں گے خام جذبے آپ کے
کاش کر سکتے کبھی بروقت کوئی فیصلہ
وقت کو دیتے رہے الزام جذبے آپ کے
دیکھیے بے کار کہہ کر مت انہیں دھتکاریے
کام آنے ہیں یہی ناکام جذبے آپ کے
ہر گھڑی سچائی کے ملبوس میں رکھا کریں
ہو نہیں سکتے کبھی نیلام جذبے آپ کے
زندگی جب بے ارادہ رقص کرنا چھوڑ دے
بھیج دیتے ہیں نیا پیغام جذبے آپ کے
آج پھر میرے لیے خوشیاں بکھیریں آپ نے
آج پھر چنتے رہے آلام جذبے آپ کے
جب غلط فہمی کبھی ناشط ہمارے بیچ ہو
دور کرتے ہیں سبھی ابہام جذبے آپ کے

اساسِ اُردو اور یورپین عسکری اہلِ قلم

شاکر کنڈان

اردو کے معنی میں کسی بھی مؤرخ، ماہر زبان، عالم لسانیات یا دانش ور کو اختلاف نہیں اور اسی اتفاق کے پیش نظر جب عساکر (لشکر) کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس میں شامل مختلف علاقوں کے لوگ، مختلف زبانیں بولنے والے لوگ اور مختلف روایات و مزاج کے لوگ ملتے ہیں جو آخر میں ایک زبان ایک ثقافت، ایک مقصد اور متفقہ روایات کا حصہ بن کر ایک لسانی خاندان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

برصغیر جسے شروع سے ہی سونے کی چڑیا" سمجھا جاتا رہا ہے، اس میں مختلف علاقوں سے مختلف زبانیں اور بولیاں بولنے والے اور مختلف تہذیبوں کے عساکر حملہ آور ہوتے رہے اور اس خطے کی مقامی زبان اور تہذیب میں کچھ دے اور کچھ لے کے اصول پر اپنا حصہ ڈالتے اور نکالتے رہے۔ برصغیر میں یورپین کی آمد کا تسلسل بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

یورپی افواج کی آمد کا سلسلہ:

معلوم تاریخ کے مطابق برصغیر میں یورپ کی عساکر کا سلسلہ یونانیوں کے حملوں سے شروع ہوا۔ ایران کی فتح کے بعد سکندرِ اعظم نے افغانستان اور ہندوستان کے اُن علاقوں کی طرف اپنا منہ موڑا جو تقریباً دو سو سال تک ایران کے زیر تسلط رہے تھے۔ چنانچہ سکندر کابل، سوات اور سرحدی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد 326 ق م میں دریائے سندھ کو پار کر کے ٹیکسلا کی جانب بڑھا جو اس زمانہ کا ایک بارونق اور ترقی یافتہ شہر تھا۔ ٹیکسلا کے راجہ نے چونکہ راجہ پورس سے عداوت کی بنا پر سکندر کو اس جانب متوجہ ہونے کی دعوت دی تھی لہٰذا اس نے سکندر کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

سکندر اور پورس کا مقابلہ دریائے جہلم کے کنارے پورس کی شکست پر تمام ہوا۔ اور اس نے مشرق کی طرف پیش قدمی کی لیکن اس کی فوج ہمت ہار چکی تھی جس پر اسے واپس لوٹنا پڑا جہاں وہ رستہ میں ہی 323 ق م میں وفات پا گیا۔

یورپ (یونان) نے 305 ق م میں جنرل سیلو کس کی سپاہ سالاری میں دوسرا حملہ کیا۔ جس میں شکست کھانے کے بعد صلح کے طور پر اپنی بیٹی کی شادی چندر گپت سے کرنے اور جہیز میں کابل ہرات اور قندھار کے علاقے دینے کے بعد اسے واپس جانا پڑا۔

ان دونوں حملوں میں یونانی افواج کا براہ راست رابطہ ہندوستانی فوجیوں نیز عوام سے بھی ہوا۔ جس میں لفظوں کا تبادلہ بھی ہوا ہوگا۔ اگرچہ اس سلسلے میں مورخین نے زیادہ جانکاری نہیں دی اور بظاہر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں نے اس کم وقت میں زیادہ اثرات نہیں چھوڑے لیکن پھر بھی اردو زبان کے مطالعے سے ایسے الفاظ ہمیں ملتے ہیں جو یونانی افواج یہاں سے جاتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑ گئیں۔ یونانی اُس وقت طب اور فلسفہ میں دنیا بھر میں تسلیم کیے جاتے تھے۔ لہٰذ بہت سے الفاظ فلسفہ اور طب کے اُن کی باقیات ہیں۔ مثلاً اردو میں ایک لفظ فیلسوف استعمال ہوتا ہے"۔ پھر ارغنون، اُصطر لاب، اتاقیا اور فیلا، وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ہم اردو تھیسارس میں دیکھتے ہیں اردو میں یونانی الفاظ کا استعمال اس لیے بھی زیادہ نہیں ہو پایا کہ وہ مشکل بھی تھے اور بے لچک بھی جبکہ اُن الفاظ کے مقابل ہمیں انگریزی، فارسی اور عربی کے آسان الفاظ یا بدلی ہوئی شکل میں ملے جن کا بولنا، پڑھنا اور لکھنا نسبتاً آسان تھا۔ یہ بھی ہوا کہ اگر کچھ الفاظ تھے بھی سہی تو اُن پر گردی پڑ گئی جس سے وہ متروک ہو گئے۔

برصغیر میں سکندرِ اعظم کے بعد یورپ سے آنے والوں میں سے آرمینین کو سبقت حاصل ہے۔ غالباً تھامس کینا (Thomas Cana) پہلا آرمینی نو وارد ہے جو ۷۸۰ء میں ساحل ملیبار پر فروکش ہوا اور اس کے بعد برابر آرمینی عیسائی وقتاً فوقتاً بغرض تجارت اور تلاشِ روزگار میں آتے رہے[1]۔ یہ لوگ طویل مسافت کر کے ایران، افغانستان اور تبت سے ہوتے ہوئے برصغیر میں آتے تھے اور اپنا مال تجارت بیچ کر واپس چلے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے انھیں شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں آباد ہونے کی ترغیب دی۔ اور وہ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے دارالخلافہ میں آ کر آباد ہوئے[2]۔ آرمینیا سے آنے والے ان لوگوں کے مقاصد عسکری یا سیاسی نہیں تھے۔ ان لوگوں نے یہاں کی زبان سیکھی اور یہاں کی زبان کے الفاظ آرمینیا میں لے گئے آرمینین جو برصغیر میں آباد ہوئے۔ یا اس سے پہلے آئے اور چلے گئے۔ ان میں اردو زبان کے ارتقا کی ان کاوشوں میں حصہ لینے والا کوئی شخص بھی عسکری نہیں تھا۔ اس میں دیگر آرمینین اردو شعراء کی نسبت دو شعراء خاصے مقبول ہوئے۔ ان میں سے ایک جو ہانس تھے جو صاحب تخلص کرتے تھے اور ان کا یہ شعر مقبول ہوا۔

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا
مجھ کو پہناتے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث[3]

اور دوسرے شاعر ارین جیکب فرحت تھے:

ستم ایسا نہ کرائے باغباں فصلِ بہاری میں
گرائیں بجلیاں ایسا نہ ہو آہیں عنادل کی[4]

۱۴۹۷ء میں پرتگال کے بادشاہ امانوال نے واسکوڈے گاما کو جنوب کی راہ سے ہندوستان جانے کا حکم دیا۔ اس وقت ہندوستان میں سکندر لودی بن بہلول خان لودی بادشاہ تھا[5]۔ یہ لوگ ہر طرح کی عسکری تیاری کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ ان تجارتی جہازوں کا تعلق مرچنٹ نیوی سے تھا۔ یہ باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ مشکلات سفرِ بحری کے ساتھ

ساتھ انھوں نے جنگ کی تربیت بھی حاصل کی ہوتی تھی۔ یہ پرتگیزی واسکوڈے گاما (۱۴۶۰ء، وفات ۲۴ ستمبر ۱۵۲۵ء کوچن، ہندوستان، تدفین پرتگال)۔ زیر کمان چار بحری جہازوں گریل، رافائیل، ریوا اور ساریو کے ساتھ ہندوستان میں مئی ۱۴۹۸ء میں گیارہ ماہ کی مسافت کے بعد ملیبار میں کالی کٹ کے مقام پر پہنچے۔ اگرچہ پرتگیزیوں کی آمد کا مقصد تجارتی بتایا جاتا ہے لیکن جب اس کا جائزہ لیتے ہیں تو اس آمد کا نتیجہ عسکری دکھائی دیتا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مقاصد تجارتی نہیں بلکہ عسکری برتری تھے۔

پرتگالیوں کی آمد بظاہر اتنا بڑا واقعہ دکھائی نہیں دیتا لیکن یہ بظاہر اتنا چھوٹا، اتنا معمولی اور اس درجہ عامتہ الورود تھا کہ بندرگار کالی کٹ کے باہر کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوسکی۔ تاہم آگے چل کر یہ واقعہ پاک و ہند کے اندر ایسے عناصر بروئے کار لانے کا موجب بن گیا جن کی وجہ سے ہمارا ملک اجنبی سامراج کی زنجیروں میں جکڑا گیا[۶]۔ واسکوڈے گاما کی آمد پر وہاں کے راجہ سمھورام یا شیام رام نے بھرپور استقبالیہ کا پروگرام ترتیب دینا چاہا لیکن اہلِ عرب ان کی آمد کا مقصد سمجھ گئے تھے۔ لہٰذا انھوں نے راجہ کو ایسا نہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ آر۔سی۔ موجمدار (Mujamdar) لکھتا ہے:

"Portuguese instead of confining themselves within the limits of legitimate trade , becames unduly ambitious to establish their supermeacy in the eastern seas by forcibly depriving the merchants of other nations of the benefits of their commerce, and molesting them inevitably brought them in to hostilities with the ruler of calicut whose prosperity was largely dependant on Arab merchants."[۷]

واسکوڈے گاما کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ فوراً اپنے ملک چلا گیا مگر دوسرے سال اسی بادشاہ نے الوارز کا برل کو مع آٹھ پادریوں کے ۱۳ جہاز دے کے بجمعیت ۱۳ ہزار سپاہیوں کے ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ مگران جہازوں میں سے صرف چھ کالی کٹ تک پہنچے[۸]۔ ۱۵۰۵ء میں المید (Almida) اور ۱۵۰۹ء میں الفانسوڈے البوقرق (Albuquerque) پرتگالی حکومت کی طرف سے بحیثیت گورنر ہندوستان آیا اور اس نے ۱۵۱۰ء میں گووا پر قبضہ کر لیا[۹]۔ پرتگالی چونکہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا سوچ رہے تھے لہٰذا اب انھوں نے ہندوستان کی زبانیں سیکھنے اور سمجھنے میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اور پھر رفتہ رفتہ گووا کے علاوہ ڈامن اور ڈیو وغیرہ جزائر کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ اور اپنی خواہشات کو وسعت دینے لگے۔ پرتگالیوں کی آمد اور چند علاقوں پر قبضہ، عوام سے میل جول اور ربط سے لسانی تبدیلیاں ایک فطری عمل تھا۔ پرتگالی زبان کے الفاظ نے مقامی زبان (ہندی یا اردو) میں اپنا رنگ دکھایا۔ اور مقامی زبان نے پرتگالی میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ اس مخلوط زبان میں پرتگالی الفاظ کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ دورِ حاضر کی روزمرہ میں وہ ابھی تک موجود ہیں اُن بہت سے الفاظ میں سے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔ چابی، اچار، اناس، پادری، مستری، نیلام، بالٹی، الماری، تمباکو وغیرہ[۱۰]۔ سولہویں صدی کے اختتام تک پرتگالی اپنے مدمقابل آنے والی ہر طاقت پر غالب رہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے اپنے جہازوں کو بحر قلزم میں بھیجنے کے لیے پرتگیزیوں (پرتگالیوں) سے اجازت نامہ حاصل کر کے ان کے اقتدار کو چپ چاپ تسلیم کر لیا[۱۱]۔

پرتگالیوں کی کامیابی کا حال سن کر ہالینڈ کے (ڈچ) لوگوں کو بھی ہندوستان کی سونے کی چڑیا کے شکار کا لالچ دامن گیر ہوا اور آخر کار ۱۶۰۱ء میں وہ بھی ایک تجارتی کمپنی بنا کر سواحل ہند پر براجمان ہو گئے[۱۲]۔ ولندیزیوں نے یہاں آ کر ایک ایسی زبان دیکھی جس میں یورپی الفاظ موجود تھے،[۱۳] گویا پرتگالی زبان کے اثرات واضح نظر آتے تھے۔ پرتگالیوں کی طرف سے یہ اثرات اردو زبان کے لیے ایک تحفہ تھے۔ اسی دوران انگلستان نے بھی اپنی کوششیں جاری کر دیں۔ انھوں نے ۱۶۰۰ء میں Governor and company of Merchants Trading into East Indies, (تجارتی کمپنی) بنائی۔ جسے پہلی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی کہا جاتا ہے[۱۴]۔ اور ملکہ الزبتھ سے اجازتِ سفر حاصل کر کے ۱۶۰۸ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار کپتان ہوپکنس (Hopkins) نے مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار سے تجارتی اجازت نامہ حاصل کیا[۱۵]۔ انگریزوں (فرنگیوں) نے ۱۶۳۳ء میں موسولی پٹم میں مشرقی ساحل پر ایک کوٹھی قائم کی اور پھر رفتہ رفتہ اس میں تیزی آتی گئی۔ ان کی آمد سے مقامی زبان میں انگریزی کے الفاظ شامل ہونے لگے۔ بہت سے الفاظ کو اردو والیا گیا اور ایک فطری لسانی تبدیلی روپذیر ہونے لگی[۱۶]۔

انگریزوں کی ریس میں فرانسیسیوں نے بھی اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی اور ۱۶۴۲ء میں رش لو (Riche Liue) نامی فرانسیسی نے دکھنی ہندوستان میں ورود کیا۔ فرانسیوں نے پانڈے چری کی بنیاد ڈالی اور اسے اپنا اڈا بنا لیا[۱۷]۔ پرتگالی، ولندیزی اور فرانسیسی تو وسیع پیمانے پر اردو زبان میں اپنا حصہ نہ ڈال سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا عرصۂ قیام ہندوستان میں اتنا زیادہ اور پُرامن نہیں رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پرتگالیوں سے سو سال بعد برطانوی آئے، اس سو سال میں پرتگالی کسی حد تک اپنے الفاظ کو اردو زبان کا حصہ بنانے میں کوشاں ضرور

رہے لیکن پھر آپس کے جھگڑوں اور برتری کے حصول میں وہ توجہ نہ دے سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر جو لوگ ہندوستان میں رہ گئے۔ وہ یہاں کا حصّہ بن گئے۔ اور اردو کو اپنی زبان بنا لیا۔ جس کی مثال ہمیں ان کے ادب و شعر سے ملتی ہے۔ اب تاریخی اسباب اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت رواج پانے والی اس زبان میں جو اصل میں شمالی ہند کی ایک عوامی بولی تھی۔ سنسکرت، قدیم ایرانی، قدیم یونانی، تورانی، فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی، انگریزی اور نامعلوم کن کن زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہے[۱۸]۔ اور اردو زبان کے ارتقا کا باعث بنتے رہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے دوسرے صوبے جو اپنے اپنے زمانے میں الگ اور مختلف ممالک کی حیثیت بھی رکھتے تھے ان کے ہاں بولی جانے والی زبانوں میں پنجابی اور دیگر بولیوں کے الفاظ اور لہجے کے باعث وہاں کی اردو قدرے مختلف رنگ میں سامنے آئی۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اورنگ زیب اور داراشکوہ کی افواج میں بھی یورپین سپاہی اور عہدے دار شامل تھے۔ جس کی ایک مثال دارا کی سپاہ میں نکولا مانوچی یا منوکی کی ہے۔ یہ ایک اطالوی تھا جو داراشکوہ کے توپ خانے میں ملازمت کرتا تھا اور بکھر کے محاصرے کے وقت ۱۶۵۹ء میں قلعے میں موجود تھا[۱۹]۔ بلکہ مانوچی ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب اور دارا کے درمیان سام گڈھ میں ہونے والی جنگ میں شریک تھا۔ اور اس کے بعد بکھر کے قلعے میں توپ خانے کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی سر گزشت 'اسٹوریادی موگور' میں کئی الفاظ ہندوستانی کے استعمال کیے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی زبان اچھی طرح جانتا تھا[۲۰]۔ اس کی سرگزشت کے ذریعے سے بھی اطالیہ میں بہت سے ہندوستانی الفاظ پہنچے۔

الغرض یہ عمل سالہا سال تک جاری رہا انگریزوں نے ہندوستان میں آمد کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہاں نئی تہذیب میں ڈھلنا اور زبان کو سیکھنا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ملازمین کے لیے لازمی قرار دیا کہ وہ اردو سیکھیں اور اس کا امتحان پاس کریں انگریزوں کا اردو زبان سیکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عیسائیت کی وسیع پیمانے پر تبلیغ کی جا سکے۔ چنانچہ جب انھوں نے اردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ تو ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا گیا جو مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ کرتا تھا۔ اور اسی بیگانگی کا سبب تھا کہ بہت سی مسلم عورتوں نے عیسائی سپاہیوں سے شادیاں کیں اور ان سے جو اولادیں ہوئیں وہ عیسائی تھیں۔

انگریزوں نے بائبل وغیرہ کے تراجم کے علاوہ لغات اور قواعد کی تیاری میں دلچسپی لی۔ اس سے قبل نہ تو لغات کی ترتیب کا کوئی معقول کام ہوا تھا۔ اور نہ ہی قواعد کی طرف کسی نے توجہ دی تھی اس ضمن میں غیر عسکری اہلِ قلم کے علاوہ جن عسکری اہلِ قلم نے اپنی خدمات انجام دیں ان کی انفرادیت کے حوالے سے ذکر یہاں مقصود نہیں۔ یہ یاد رہے کہ ان لوگوں نے جہاں اردو رسم الخط میں اپنی تحریریں چھوڑیں وہاں رومن میں اور انگریزی میں بھی کام کیا۔ اردو رسم الخط میں جو سب سے پہلی کتاب شائع ہوئی وہ اپریل ۱۷۴۳ء میں جرمنی کے شہر ہالے سے بنجمن شلز کی کتاب Summula doctrinae in lingvum indostanicum ہے[۲۱]۔ یہ نام اگرچہ جرمن زبان میں ہے لیکن سلیم الدین قریشی کا دعویٰ ہے کہ یہ اردو رسم الخط میں پہلی کتاب ہے۔

انگلستان میں ۱۷۷۷ء تک فارسی کے لیے نسخ ٹائپ استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۷۷۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء-۱۷۸۴ء) نے نستعلیق چھپائی کی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے چارلس ولکنز کو یہ ذمہ داری سونپی اور پھر ''ولکنز کے نستعلیق ٹائپ سے ہندوستان میں جو سب سے پہلی کتاب شائع ہوئی وہ ایک فوجی گلیڈون کی تھی۔ اور اردو طباعت کی سب سے پہلی مثال مرزا سودا کی ایک اردو غزل ہے''[۲۲]۔ یاد رہے کہ مرزا سودا کا تعلق بھی فوج سے تھا۔ اردو ادب کے فروغ میں چند خاندانوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ جن میں گارڈنر خاندان، مانتوم خاندان، لیزا خاندان، سومر خاندان اور بالتھرز خاندان وغیرہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ ان خاندانوں میں ہر دو طبقے سے تعلق لکھنے والے اہلِ قلم تھے۔ کچھ ایسے تھے۔ جنھوں نے سول ملازمتیں اختیار کرتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیں۔ اور کچھ اہلِ قلم نے سول پر فوج کو ترجیح دی اور صاحبانِ سیف و قلم کہلوائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں قدم جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ لیکن ابھی تک اس نے زیادہ طاقت نہیں پکڑی تھی۔ اس اثناء میں انھوں نے کلکتہ میں ولیم نامی ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اور پھر انگلستان سے ایک گورا پلٹن بھی طلب کر کے تعینات کر لی۔ اس قلعہ یعنی فورٹ ولیم نے بعد میں اردو زبان و ادب کے فروغ اور ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کیا۔'' کمپنی بہادر نے شروع میں تین مختلف افواج قائم کی تھیں۔ مدراس آرمی، بنگال آرمی اور بمبے آرمی۔ یہ تینوں افواج ایک دوسرے سے الگ اور آزاد تھیں۔ ان کے کمانڈر انچیف بھی علیحدہ علیحدہ تھے''[۲۳]۔ ان تینوں افواج کی نفری مختصر سی تھی۔ اور چونکہ انھیں ضرورت کے مطابق خود بھی جوان بھرتی کرنے کی اجازت تھی لہٰذا مقامی لوگوں کو زیادہ مواقع ملے۔ یہاں تک کہ کمان انگریزوں کی ہوتی تھی اور جوان ہندوستان کے۔ اس سے ایک طرف اردو زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو دوسری طرف کمپنی کے اپنے مقاصد بھی حل ہوئے۔ جو ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق:

''ایک تو اپنی تجارتی کوٹھیوں کی حفاظت کے

لیے، کیونکہ اٹھارویں صدی میں جب مرکزی سلطنت ٹوٹی تو طاقت ور فوجی مہم جوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس وجہ سے انھیں فوج کی ضرورت پڑی جو اس لوٹ مار سے انھیں محفوظ رکھ سکے۔ دوسری وجہ انگریزوں اور فرانسیوں کی باہمی رقابت تھی۔ جو یورپ اور امریکہ سے ہوتی ہوئی بعد ازاں ہندوستان بھی آ گئی۔ اور یہاں دونوں نے ایک دوسرے کی رقابت میں اپنی فوجوں کی تعداد بڑھائی اور وہ نئی ایجادیں جو سترھویں صدی میں یورپ میں ہوئیں انھیں لے کر آئے۔ خصوصیت سے فوجی تنظیم وترتیب اور تکنیک۔''[24]

بنگال میں حکمرانوں کا شعور جاگ اٹھا تھا۔ نواب علی وردی خان انگریزوں کے عزائم سے واقف ہو چکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مرزا محمد، نواب سراج الدولہ جب مسندِ حکمرانی پر جلوہ افروز ہوئے۔ تو انھوں نے انگریزوں کی دست درازیوں کو روکنا چاہا۔ جس کے نتیجے میں ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی ہوئی۔ اگرچہ انگریزوں کے پاس فوج نواب سراج الدولہ کی نسبت بہت کم تھی لیکن لارڈ کلائیو نے ایک اور چال چلی اور نواب کے وزیر میر جعفر کو کئی دیگر سالاروں اور سرداروں کے ہمراہ خرید لیا۔ جس سے موصوف ان غداروں کی وجہ سے شہید ہوئے۔ اور میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اور بنگال، بہار اور اوڑیسہ مسلمانوں کے ہاتھ سے چلے گئے۔ جس دن نواب سراج الدولہ نے جامِ شہادت نوش کیا اسی دن ہندوستان میں گویا انگریزی عمل داری کی بنیاد رکھ دی گئی اور پھر آٹھ سال بعد'' ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم بادشاہ نے جو اس وقت دلی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ صوبہ بہار، بنگالا اوڑیسہ تینوں صوبوں کی استمراری دیوانی کا پروانہ کمپنی کے نام لکھ دیا''[25]۔

نواب سراج الدولہ کی شہادت (۱۳ جون ۱۷۵۷ء) کے بعد انگریزوں کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ میسور کی سلطنت تھی جسے ٹیپو سلطان جیسا بہادر سپاہی چلا رہا تھا۔ انگریز جو کہ آہستہ آہستہ قدم جمارہے تھے اس سیسہ پلائی دیوار کو بھی گرانا چاہتے تھے لہٰذا:

''کمپنی سرکار اور نظامِ دکن نے یکم ستمبر ۱۷۹۸ء کو ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے اگر کوئی تیسری طاقت کمپنی یا نظامِ دکن پر حملہ آور ہوتی ہے۔ تو دونوں مل کر اس طاقت کا مقابلہ کریں گے اور صاف ظاہر ہے یہ ٹیپو سلطان کے خلاف ایک معاہدہ تھا لہٰذا ایک سب سیڈیری فوج (Subsidiary Force) قائم کی گئی۔ جو چار پلٹنوں (فی پلٹن ایک ہزار جوان)، ایک رجمنٹ (پانچ سو سواروں) اور توپ خانے پر مشتمل تھی اور جسے مملکت حیدرآباد میں متعین کیا گیا۔ اس فوج اور توپ خانے کا خرچ سالانہ بیس لاکھ ستر ہزار روپے تھا۔ اس پورے خرچ کی ادائیگی کی ذمہ داری نظام پر تھی لیکن فوج پر پورا کنٹرول انگریزی فوج کے افسروں کا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس فوج میں دو پلٹنوں اور ایک رجمنٹ کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ ان تمام مصارف کے لیے نظام سرکار نے وہ تمام علاقے دواماً کمپنی سرکار کے حوالے کر دیے جو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی تیسری اور چوتھی جنگ میسو کے بعد انھیں ملے تھے''[26]۔

مسلم ریاستوں سے اس اتحاد میں انگریز اور مقامی عسکری ایک دوسرے میں گھل مل گئے۔ کمان انگریز کی تھی لہٰذا ان کے افسروں نے بہتر کمان اور کنٹرول کے لیے اردو زبان سیکھی اور اسے باحسن استعمال کیا۔ زبان سیکھنے کے لیے لغات اور گرائمر و قواعد کی کئی کتب ان عسکریوں میں سے اہل قلم نے لکھیں اس سے اردو زبان انگریزوں میں رچ بس گئی۔ انہیں چوں کہ لازماً اردو زبان بولنا پڑتی تھی اس سے ان کے گھروں میں بھی یہ زبان اثر دکھانے لگی اور جب وہ برطانیہ جاتے تو وہاں بے خیالی میں اردو کے الفاظ انگریزی میں بول دیتے۔ یوں یہ زبان ہندوستان سے باہر کچھ کچھ لفظوں کی صورت برطانیہ میں بھی اپنا اثر دکھانے لگی۔ اس پر طرہ یہ کہ برطانیہ میں اردو زبان سکھانے کے ادارے بھی کام کرنے لگے اور جو لوگ برصغیر میں آتے یا آنے کے خواہشمند ہوتے وہ اردو زبان وہاں سے سیکھ کر آتے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جو عملاً دکھائی دیتا ہے کہ فرنگیوں کے سامنے اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ٹیپو کی شہادت کے ساتھ ہی فرانس کا بھی برصغیر میں خاتمہ ہو گیا۔ یورپین کی آمد سے اب تک مختلف اوقات میں جو عسکری باوردی شخصیات اردو کے فروغ اور اس زبان کے ارتقاء کے لیے سرگرداں رہیں ان میں سینکڑوں لوگوں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے چند نام درج ذیل ہیں۔ جنھوں نے اردو، انگریزی یا رومن کے ذریعے برصغیر کی مقامی زبان میں کام کرتے ہوئے انگریزوں کو اس زبان سے متعارف کروایا۔ یا اس زبان کو انگریزی سے متعارف کروایا۔ جن کے سبب یورپ میں زبانِ اردو بولی اور سمجھی جانے لگی۔ کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن، کرنل ایس ای ایبٹ، میجر جنرل لائیڈ، کیپٹن کک، کیپٹن سارلیس، کیپٹن والٹر پیٹن، لیفٹیننٹ کرنل ٹاڈ، لیفٹیننٹ کرنل الیگزینڈ داؤ ڈھیلر، میجر راورٹی، لیفٹیننٹ کرنل میکنگ، لیفٹیننٹ کرنل ینگ، لیفٹیننٹ کرنل ڈاونٹن، لیفٹیننٹ میجر اولینڈ سن[27] وغیرہ۔ لیکن ایک نام جو اگرچہ باقاعدہ فوجی نہیں تھا لیکن فوج میں بحثیت ڈاکٹر ہندوستان میں ورود کے بعد اس نے خدمات انجام دیں، اردو زبان کو اس کا صحیح مقام دینے اور دلانے میں اس شخص کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور وہ شخص ہے گلکرسٹ، (ڈاکٹر جان باتھ ورک گلکرسٹ)، جس نے اپنا مدرسہ کھولا اور تعلیم کا آغاز کیا۔ پھر فورٹ ولیم کالج کے چار سالہ قیام میں تریسٹھ کتب تصنیف و ترجمہ اور تالیف

CS CamScanner

کروائیں [۲۸]۔ نیز گلکرسٹ کی اپنی تصانیف کی تعداد گیارہ ہے [۲۹]۔ ان کے علاوہ اردو زبان کے فروغ میں وہ انگریز حکمران بھی شامل ہیں جو ۱۸۰۰ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے برصغیر کے کسی نہ کسی خطے پر حاکم رہے۔ وہ جنگوں کا حصہ بھی رہے۔ اور خود اردو زبان سیکھنے اور اسے ترقی دینے کا بالواسطہ یا بلا واسطہ حصہ بھی رہے۔

ٹیپو سلطان کی فوج کو شکست دینے والے گورنر جنرل لارڈ رچرڈ کوئیس ولزلی ۱۷۹۸ء میں جب ہندوستان میں گورنر جنرل مقرر کیا گیا تو اس کی کو شدت سے محسوس کیا کہ ہندوستان میں ملازمت کے لیے مقیم برطانوی افسروں اور سپاہیوں کو یہاں کی مقامی زبان جو اردو ہے، سکھانا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے کسی اچھی درسگاہ کا ہونا بھی لازم ہے۔ لہٰذا اس نے کمپنی کے ملازمین کو اعلیٰ پیمانے پر تعلیم دلوانے کی غرض سے ایک طویل اور مدلل یادداشت لکھ کر کمپنی سے ایک کالج قائم کرنے کی اجازت چاہی اور پھر وقت ضائع کیے بغیر جولائی ۱۸۰۰ء کو کالج کا افتتاح کر دیا۔ لیکن ٹیپو سلطان کی شہادت کے دن کے باعث اندراج ۴ مئی ۱۸۰۰ء کیا گیا۔ لارڈ ولزلی اس میں ایشیاء کی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتا تھا لیکن اردو میں نثر مفقود ہونے کی وجہ سے ایک ادارہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا۔ اس ادارہ نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ اردو میں مصنفین نے کتابیں لکھی بھی اور لکھوائیں بھی نیز تراجم میں کیے گئے جس سے اردو زبان نثر میں بھی اپنا وجود منوانے کے قابل ہو گئی۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ''اردو الفاظ ایک بین الاقوامی رابطہ''، مصنف خود بہرائچ (بھارت) ۱۹۸۸ء، ص ۴۱

۲۔ محمد یوسف الدین، خواجہ، ''تذکرہ یورپین اور انڈو یورپین شعرائے اردو''، مطبع ابراہیمہ حیدر آباد، دکن ۱۹۵۹ء، ص ۳۵

۳۔ Ram Babu Saksena, European and Indo -European poets of urdu and persian, Book Traders, Lahore, p 8

۴۔ Ibid, p-9

۵۔ صفیر بلگرامی، سید فرزند احمد، ''تذکرہ جلوہ خضر'' (جلد اول و دوم) مطبع نور الانوار، لکھنؤ، ۱۸۸۵ء، ص ۲

۶۔ غلام رسول مہر، مولانا، ''۱۸۵۷ء''، کتاب منزل لاہور، س ن، ص ۲۱

۷۔ Mojumdar, R.C. An Advanced History of India ,vol 8,Aziz publisher, Lahore, 1980,p-632

۸۔ صفیر بلگرامی، سید فرزند احمد، ایضاً، ص ۴۱

۹۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ''اردو الفاظ ایک بین الاقوامی رابطہ''، ص ۴۱

۱۰۔ ضامن علی ایم، اے، مولوی سید، ''اردو زبان و ادب'' کے مترا انڈین پریس الہ آباد، ۱۹۲۷ء، ص ۷

۱۱۔ مورلینڈ، ڈبلو۔ ایچ، ''اکبر سے اورنگ زیب تک''، مترجم: جمال محمد صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند، نئی دہلی، چوتھی بار، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳

۱۲۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۴۳

۱۳۔ عطش درانی، ''اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۱۲

۱۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ اور تحقیق''، فکشن ہاؤس لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص ۸۹

۱۵۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۴۳

☆ رام بابو سکسینہ اور دیگر کئی مورخین نے یہ نام ہو پکنس کی بجائے ہوکنس لکھا ہے۔

۱۶۔ عطش درانی، ''اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم''، ایضاً، ص ۱۳

۱۷۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۴۳

۱۸۔ مسعود حسن رضوی ادیب، سید، ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط''، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۴۸ء، ص ۷

۱۹۔ عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر میمن، ''نگارشاتِ سندھ''، سندھی ادبی اکیڈمی لاڑکانہ (سندھ) ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۳

۲۰۔ نکولاؤ مونوچی، ''داستانِ مغلیہ'' (اسٹوریادی موگور کا ترجمہ) مترجم: سجاد باقر رضوی، نگارشات لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۶

۲۱۔ سلیم الدین قریشی، ''اٹھارویں صدی کی اردو مطبوعات'' (توضیحی فہرست) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۳۔ سکندر خان بلوچ، ''تاریخ کے زخم''، الفصیل ناشران لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۸۸

۲۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''برطانوی راج، ایک تجزیہ''، فکشن ہاؤس لاہور، بار دوم، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳

۲۵۔ شیو پرشاد، بابو، ''جامِ جہاں نما''، جلد دوم، مطبع نول کشور لکھنو، بار دوم ۱۸۶۰ء، ص ۱۴

۲۶۔ محمد جواد رضوی، سید، ''ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی'' (ابتدائی دور)، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۴۷

۲۷۔ لیفٹیننٹ اور میجر دو الگ رینک ہیں۔ میرے مطالعے میں بریگیڈیئر جنرل، میجر جنرل اور لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تو آئے ہیں لیکن لیفٹیننٹ میجر کا رینک میرے علم میں نہیں ہے ممکن ہے میجر اولینڈ سن نام ہو اور لیفٹیننٹ عہدہ ہو جیسے ہمارے شہید نشانِ حیدر کیپٹن، کرنل شیر خان جن کا نام کرنل شیر خان اور رینک کیپٹن ہے۔ یا برطانیہ کے ایک وزیر اعظم بھی میجر رہے ہیں۔

۲۸۔ محمد عتیق صدیقی، ''گل کرسٹ اور اس کا عہد''، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۳۸

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۸۹

CamScanner

اُردو ادب کے لاپتہ کردار

لبنیٰ صفدر / لاہور

اردو ادب کی بوقلمونی میں کرداروں کی تشکیل اور ان کی تحلیل ایک ایسا پیچیدہ سفر ہے۔ جو داستانوں کے مافوق الفطرت جزیروں سے شروع ہو کر جدید افسانے کے وجودی صحراؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طویل مسافت میں کئی ایسے کردار ہیں جو وقت کی بے رحم موجوں کے ساتھ اس طرح بہہ گئے کہ ان کا نشان ڈھونڈنا اب ادب کے آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا کام معلوم ہوتا ہے۔ قدیم داستانوں کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہاں فرد اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ موجود نہیں تھا بلکہ وہ ایک عالمگیر آفاقی نمونے کا حصہ تھا۔ داستانوں کا ہیرو ایک ایسا مثالی وجود تھا جس کی ہمت، شجاعت اور حسن عالمگیر پیمانوں پر پورا اترتے تھے لیکن اسی چکا چوند میں وہ عام انسان لاپتہ ہو گیا جو اپنی کمزوریوں، خوف اور ناکامیوں کے ساتھ جیتا تھا۔ داستانِ امیر حمزہ ہو یا طلسمِ ہوش رُبا، وہاں جادوگروں کی عیاری اور شہزادوں کی مہم جوئی کے درمیان وہ عام سپاہی یا وہ شہری غائب ہے جو ان جنگوں کا ایندھن بنتا تھا۔ ان طلسماتی پردوں کے پیچھے وہ سسکتی ہوئی زندگی غائب تھی جو محلوں کی اونچی دیواروں کے سائے میں بندگی اور غلامی کی چکی میں پس رہی تھی۔ وہاں باندیوں اور خادموں کا ذکر تو ملتا ہے مگر ان کی اپنی کوئی کہانی، ان کا اپنا کوئی دکھ یا ان کی اپنی کوئی شناخت نہیں تھی۔ وہ صرف شہزادوں اور شہزادیوں کی مہم جوئیوں کے لیے پس منظر فراہم کرنے والے بے جان مہرے بن کر رہ گئے تھے۔ داستانوی ادب میں جادوگر، جن اور پریاں تو کثرت سے ملتے ہیں لیکن وہ کسان جو ان زمینوں پر ہل چلاتا تھا جہاں طلسمی جنگ لڑی جاتی تھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ کرداروں کی پہلی بڑی ہجرت تھی جہاں انسان اپنے ہی قصوں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ میر امن کی باغ و بہار میں بھی اگرچہ انسانی جذبات کی جھلک ملتی ہے مگر وہاں بھی کردار تقدیر کے تابع ہیں۔ ان کی اپنی مرضی یا داخلی کشمکش کا وہ روپ لاپتہ ہے جو ہمیں جدید دور کے انسان میں نظر آتا ہے۔

جوں جوں زمانہ بدلا اور داستانوں کا طلسم ٹوٹا۔ اردو ادب حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوا۔ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے بعد جب ڈپٹی نذیر احمد اور سر سید احمد خان نے ادب کو اصلاحِ معاشرہ کا ذریعہ بنایا تو ایک نئے قسم کی گمشدگی کا آغاز ہوا۔ اب ادب میں وہ کردار لاپتہ ہونے لگے جو کسی اخلاقی سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔ نذیر احمد کے ہاں نصوح اور اصغری جیسے کردار تو نمایاں ہوئے لیکن وہ باغی انسان جو اپنی جبلتوں کے پیچھے بھاگتا تھا یا جو مذہبی اور معاشرتی ضابطوں سے آزاد رہنا چاہتا تھا ادب کے صفحوں سے خارج کر دیا گیا۔ یہ دور تطہیر کا دور تھا جہاں کرداروں کو گوشت پوست کے انسان بنانے کے بجائے اخلاقی نمونوں میں ڈھال دیا گیا۔ اس عمل میں انسان کی وہ فطری بے راہ روی اور معصوم گناہ گاری لاپتہ ہو گئی جو زندگی کا اصل حسن ہے۔ ادب ایک ایسی درس گاہ بن گیا جہاں صرف اچھے بچوں اور سلیقہ شعار خواتین کی گنجائش تھی اور وہ کردار جو زندگی کو اس کی تمام تر غلاظتوں اور رعنائیوں کے ساتھ جینا چاہتے تھے حاشیے پر چلے گئے۔ رتن ناتھ سرشار کے ہاں اگرچہ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کے کچھ جیتے کردار نظر آتے ہیں مگر وہاں بھی طبقہ اشرافیہ کے زوال کا شور اتنا بلند ہے کہ گلی کوچوں میں بسنے والے حقیقی پست قد کردار اس ہنگامے میں دب کر رہ گئے۔ آزاد کے کرداروں میں مزاح تو ہے لیکن ان کی روح کا وہ کرب غائب ہے جو ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے نوحے کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے تھا۔ یہاں کردار ایک تماشائی بن گیا ہے اور اس تماشے میں وہ اپنی اصل شناخت کھو چکا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب پریم چند نے دیہات کی خاک چھانی تو اردو ادب کو پہلی بار ان کرداروں کا سراغ ملا جو صدیوں سے لاپتہ تھے۔ کسان، چمار اور کھیتوں میں پسنے والے مزدور پہلی بار ادب کے مرکز میں آئے۔ گودان کا ہوری ہو یا کفن کے گھیسو اور مادھو، یہ وہ لوگ تھے جنہیں معاشرے نے مردہ قرار دے دیا تھا مگر ادب نے انہیں حیاتِ جاودانی بخشی۔ لیکن یہاں بھی ایک عجیب تضاد پیدا ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے جب سماجی حقیقت نگاری کا نعرہ بلند کیا تو انہوں نے ان طبقات کو تو آواز دی جنہیں پہلے نظر انداز کیا گیا تھا مگر اس عمل میں انسان کا داخلی وجود کہیں کھو گیا۔ سعادت حسن منٹو نے اگرچہ طوائفوں، دلالوں اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا لیکن ایک عام متوسط طبقے کا وہ انسان جو صرف اپنی روٹی کی فکر میں نہیں بلکہ اپنی روح کے کرب میں مبتلا تھا وہ اس نعرہ بازی کے شور میں لاپتہ ہو گیا۔ مادی جدوجہد اور طبقاتی کشمکش کے اس دور میں انسان کی مابعد الطبیعیاتی پیاس اور اس کے وہ سوالات جو پیٹ کی بھوک سے ماورا تھے

رجعت پسندی قرار دے کر پسِ پشت ڈال دیے گئے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں رومانوی انقلاب تو ملتا ہے مگر اس میں فرد کی وہ گہری تنہائی گم ہوگئی جو سماجی تبدیلیوں کے باوجود برقرار رہتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے گھریلو زندگی کے کرداروں کو جس باریک بینی سے تراشا وہاں بھی عورت کے کئی لاپتہ رخ ایسے تھے جو ممتا اور ایثار کی روایتی چادر تلے چھپے رہے۔ بیدی کے ہاں لاپتہ کردار وہ معصومیت ہے جو گھریلو تشدد اور سماجی دباؤ کے تلے کچل دی جاتی ہے مگر اسے زبان دینے والا کوئی نہیں۔

تقسیمِ ہند کے المیے نے اردو ادب کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں لاپتہ کردار کا مفہوم ہی بدل گیا۔ اب کردار صرف کاغذ پر نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں بھی لاپتہ ہونے لگے۔ ہجرت کے دکھ نے انسانوں سے ان کی جڑیں چھین لیں اور وہ اپنی شناخت کی تلاش میں در بدر ہوگئے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کردار اپنی گمشدہ بستیوں، پرانے درختوں اور دیومالائی قصوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ یہاں کردار خود اپنی ذات سے لاپتہ ہے؛ وہ حال میں سانس لیتا ہے مگر اس کا وجود ماضی کے کسی نامعلوم گوشے میں مقیم ہے۔ یادوں کے اس جنگل میں انسان ایک ایسی پرچھائی بن گیا ہے جو اپنے ہی عکس کو پہچاننے سے قاصر ہے۔ بستی کا ذاکر ہو یا آگے سمندر ہے کے کردار، یہ سب اپنی جڑوں سے کٹ کر ایک ایسے خلا میں پہنچ گئے ہیں جہاں زمین لاپتہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ضخیم ناولوں میں ہم تاریخ کے لاپتہ تسلسل کو پاتے ہیں جہاں کردار زمانوں کے سفر میں اپنی شناخت بدلتے رہتے ہیں مگر ان کی روح کا جوہر کہیں گم رہتا ہے۔ آگ کا دریا میں گوتم نیلمبر کے مختلف روپ دراصل اس انسانی روح کی تلاش ہے جو وقت کے بہاؤ میں کہیں کھوگئی ہے۔ جدیدیت کے زیرِ اثر جب علامت نگاری کا رواج ہوا تو کرداروں کے نام اور چہرے بھی چھین لیے گئے۔ اب وہ صرف ایک آدمی یا سایہ بن کر رہ گیا۔ انور سجاد اور نیرّ مسعود کے ہاں کردار ایک ایسی پراسرار فضا میں سانس لیتے ہیں جہاں حقیقت اور خواب کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ نیرّ مسعود کے افسانوی جہان میں اشیاء تو بولتی ہیں مگر انسان گنگ ہو چکے ہیں۔ یہاں انسان اپنی سماجی حیثیت سے مکمل طور پر لاپتہ ہوکر ایک وجودی خلا میں معلق ہو چکا ہے۔ اس دور کا انسان خاموش کردار ہے جو بولتا نہیں بلکہ اس کی خاموشی اس کے ہونے کی واحد دلیل بن جاتی ہے۔

مابعد جدیدیت کے تناظر میں جب ہم عصری اردو افسانے کا جائزہ لیتے ہیں تو کردار کی گمشدگی ایک نئی اور زیادہ خوفناک شکل میں سامنے آتی ہے۔ اب انسان ایک جیتا جاگتا وجود ہونے کے بجائے ڈیجیٹل کائنات کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ آج کے افسانے میں وہ کردار لاپتہ ہیں جو کسی نظریے یا آدرش کے لیے جیتے تھے۔ اب کردار صرف اپنی فوری ضرورتوں اور لمحاتی لذتوں کے اسیر ہیں۔ ورچوئل دنیا کی مصنوعی روشنیوں میں انسان کی اصل شخصیت لاپتہ ہوگئی ہے اور اس کا سوشل میڈیا پروفائل اس پر حاوی ہو چکا ہے۔ معاصر افسانہ نگار اس لاپتہ انسان کی تلاش میں ہیں جو ٹیکنالوجی کے بوجھ تلے دب کر اپنی حسیت کھو چکا ہے۔ جبری گمشدگی کا موضوع بھی جدید اردو ادب میں ایک اہم استعارہ بن کر ابھرا ہے جہاں انسان محض سیاسی وجوہات کی بنا پر نہیں بلکہ ایک بے حس نظام کے ہاتھوں اپنی شناخت اور وجود سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ دراصل ان کرداروں کی بازیافت کی کوشش ہے جو کبھی عقیدے کے نام پر کبھی سماج کے نام پر اور کبھی ترقی کے نام پر قربان کر دیے گئے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قدیم داستانوں سے جدید افسانے تک کا سفر ایک ایسا دائرہ ہے جو وہیں آ کرل رہا ہے جہاں سے شروع ہوا تھا۔ داستانوں کا انسان جادو کے اثر سے پتھر کا ہو جاتا تھا اور آج کا انسان ٹیکنالوجی اور مادیت کے اثر سے مشین بن چکا ہے۔ دونوں صورتوں میں حقیقی انسان لاپتہ ہے۔ اردو افسانے نے ہر عہد میں ان لاپتہ کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ چاہے وہ پریم چند کی مٹی سے جڑی سچائی ہو، منٹو کی بے باک حقیقت نگاری ہو یا انتظار حسین کی اساطیری یادیں، سب کا مقصد اس انسان کو تلاش کرنا ہے جو حالات کی گرد میں کہیں چھپ گیا ہے۔ یہ مضمون دراصل اس لاپتہ کردار کا نوحہ بھی ہے اور اس کی تلاش کا سفر بھی۔ جب تک انسان اپنی اصل فطرت سے دور رہے گا ادب میں گمشدگی کا یہ عمل جاری رہے گا۔ لیکن امید کی کرن یہ ہے کہ ادب کبھی ہار نہیں مانتا۔ وہ ہر دور میں کسی نہ کسی روپ میں ان کرداروں کو واپس لے آتا ہے جنہیں دنیا بھلا چکی ہوتی ہے۔ آج کے ادیب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اس بھیڑ میں گم ہو جانے والے فرد کو تلاش کرے اور اسے اس کے نام اس کے دکھ اور اس کی شناخت کے ساتھ دوبارہ زندہ کرے۔ یہی اردو ادب کا اصل جوہر ہے اور یہی اس کے ارتقاء کی ضمانت ہے۔

CamScanner

بقیہ انٹرویو: عمرانہ مشتاق

ارژنگ: بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

میرا نام ڈاکٹر عمرانہ مشتاق ہے۔ میری پیدائش ضلع سیالکوٹ کے گاؤں خانپور سیداں میں ہوئی، جو میرے والدین کا آبائی گاؤں ہے۔ اس زمانے میں میرے والد صاحب پولیس آفیسر تھے اور ان کی پوسٹنگ کراچی میں تھی، جبکہ میری والدہ صاحبہ اپنے میکے آئی ہوئی تھیں، اسی دوران میری پیدائش گاؤں میں ہوئی۔

میرے ابتدائی دن مختلف شہروں میں گزرے۔ بچپن کا کچھ حصہ لاہور میں گزرا، تاہم زیادہ عرصہ گوجرانوالہ میں رہا جہاں میرے والد صاحب کی پوسٹنگ تھی۔ چونکہ ہم سب بہن بھائی زیرِ تعلیم تھے، اس لیے میری والدہ نے وہیں قیام کو ترجیح دی۔ میں نے اپنی گریجویشن بھی گوجرانوالہ سے مکمل کی۔

بعد ازاں ہماری فیملی لاہور منتقل ہو گئی جہاں میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی جغرافیہ کیا۔ اسی دوران میری شادی بھی ہو گئی اور خوش قسمتی سے میرا سسرال بھی لاہور میں ہی تھا، اس لیے میں وہیں مقیم ہو گئی۔ شادی کے بعد میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور پنجاب یونیورسٹی ہی سے ایم فل اور پھر پی ایچ ڈی مکمل کی۔

ارژنگ: ادب سے شوق کی ابتدا؟

عمرانہ مشتاق: ادب سے شوق کے بارے میں اگر بات کروں تو حقیقت یہ ہے کہ یہ شوق اُس وقت پیدا ہوا جب مجھے خود یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ادب کیا ہوتا ہے۔ ہمارے بچپن کا زمانہ ایسا تھا جب والدین بچوں کی تربیت پر بہت زیادہ توجہ دیا کرتے تھے، اور میرے والدین نے بھی ہم سب بہن بھائیوں کی نہایت اچھے ماحول میں پرورش کی۔ ہم نو بہن بھائی تھے، اس لیے گھر میں ہر عمر کے بچوں کی موجودگی نے ایک علمی اور ادبی فضا پیدا کر رکھی تھی۔

اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر میں رسائل اور اخبارات کا آنا معمول تھا۔ چھوٹے بچوں کے لیے "بچوں کی دنیا" اور "تعلیم و تربیت" جیسے رسائل آتے تھے، جبکہ روزنامہ اخبار میں بچوں کا صفحہ بھی شامل ہوتا تھا جسے پڑھنے کے لیے ہم بہن بھائیوں میں باقاعدہ مقابلہ ہوتا تھا۔ بڑے بہن بھائیوں کے لیے "اردو ڈائجسٹ" اور "ریڈر ڈائجسٹ" جیسے رسائل آتے تھے، اور میری بڑی بہن کے لئے زیب النساء۔ حور ماہانہ ادبی رسائل بھی لگے ہوئے تھے۔

جب میں نے اردو پڑھنا سیکھی تو انہی رسائل اور افسانوں کو شوق سے پڑھنا شروع کر دیا، جو میرے اندر ایک خاموش ادبی شعور کو بیدار کرنے لگے۔

گھر کا ماحول بھی اس شوق کے پروان چڑھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا رہا۔ میری والدہ صاحبہ خود ایک شاعرہ تھیں۔ اگرچہ انہوں نے کبھی باقاعدہ طور پر مشاعروں میں شرکت نہیں کی، لیکن ان کا ذوقِ ادب بہت گہرا تھا۔ وہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، حافظہ قرآن تھیں اور تجوید و تفسیر کی تعلیم یافتہ تھیں۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انہوں نے غزلیں اور نظمیں بھی لکھیں، لیکن بعد میں ان کا رجحان نعت گوئی کی طرف زیادہ ہو گیا، خاص طور پر اردو اور پنجابی میں۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ تہجد کے وقت اٹھ کر نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نعتیں پڑھا کرتی تھیں، اکثر آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے۔ میری آنکھ ایک ایسے ہی روحانی اور ادبی ماحول میں کھلی اور میری پرورش اسی فضا میں ہوئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادب سے میرا تعلق کسی شعوری فیصلے کے تحت نہیں بلکہ ایک فطری انداز میں، آہستہ آہستہ پروان چڑھتا گیا۔ مجھے خود بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ شوق کب دل میں جگہ بنا گیا اور میری شخصیت کا حصہ بن گیا۔

ارژنگ: آپ شعر کہتی ہیں . ناول لکھتی ہیں، مقبول کالم نویس ہونے کے ساتھ ساتھ کم و بیش تمام اصناف سخن میں آپ نے تخلیقی کام کیا ہے، زیادہ محبوب کونسی صنف سخن ہے؟

عمرانہ مشتاق: جیسا کہ آپ نے ذکر کیا کہ میں نے ناول، افسانے، شاعری (اردو اور پنجابی دونوں میں)، مختلف اصنافِ شاعری، کالمز اور مضامین لکھے ہیں، تو اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان میں سے سب سے پسندیدہ صنف کون سی ہے، تو اس کا جواب قدرے دلچسپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت میں جو کچھ لکھ رہی ہوتی ہوں، وہی اس لمحے میری سب سے پسندیدہ تخلیق بن جاتی ہے۔

جب انسان شاعری کرتا ہے اور شعر تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہی اس کے دل کے سب سے قریب اور محبوب ترین اظہار ہے۔ اسی طرح جب میں نثر لکھ رہی ہوتی ہوں، خاص طور پر کوئی افسانہ، کالم یا مضمون، تو اُس لمحے وہی تحریر میرے لیے سب سے زیادہ اہم اور عزیز ہوتی ہے۔

مزید یہ کہ بعض اوقات وہ تخلیقات جو قارئین میں زیادہ پسند کی جاتی ہیں، وہ خود لکھنے والے کو بھی ایک خاص طور پر عزیز لگنے لگتی ہیں۔ گویا تخلیق کا عمل ایک ایسا مسلسل سفر ہے، جس میں ہر نیا لفظ، ہر نئی تحریر اپنے وقت میں سب سے زیادہ دل کے قریب محسوس ہوتی ہے۔

ارژنگ: کسی ادبی تحریک کا بھی حصہ رہی ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے

عمرانہ مشتاق: جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا میں کسی ادبی تحریک کا حصہ رہی ہوں، تو میں کسی باقاعدہ ادبی تحریک سے تو وابستہ نہیں رہی، لیکن ادبی تنظیموں کے ساتھ میرا تعلق ہمیشہ بہت مضبوط رہا ہے۔ میں نہ صرف مختلف ادبی تنظیموں کا حصہ رہی ہوں بلکہ اپنی ادبی تنظیم بھی قائم کی ہے، اور آج بھی متعدد تنظیموں میں ایک فعال اور متحرک کردار ادا کر رہی ہوں۔ ان کی قیادت کرنا اور ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینا میری عملی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔

رہی بات اس سوال کی کہ کیا ادیبوں کو سیاست میں آنا چاہیے، تو میرے نزدیک سیاست اور ادب کا تعلق براہِ راست اس انداز میں نہیں کہ کسی پر لازم ہو کہ وہ سیاست میں آئے یا نہ آئے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ادیب ایک حساس طبیعت کا حامل ہوتا

ہے۔ اس کی مشاہدہ کرنے کی صلاحیت عام لوگوں سے زیادہ گہری ہوتی ہے، اور وہ معاشرتی مسائل کو نہ صرف جلد محسوس کرتا ہے بلکہ انہیں مؤثر انداز میں بیان کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

اسی لیے اگر ادیب سیاست میں آئیں تو وہ عوامی مسائل کو بہتر طور پر سمجھ کر انہیں مؤثر انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس زبان و بیان کی وہ قوت ہوتی ہے جو مسائل کو نہ صرف اجاگر کرتی ہے بلکہ ان کے حل کی طرف بھی رہنمائی کر سکتی ہے۔

تاہم بدقسمتی سے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب کبھی کسی ادیب کو سیاست میں آنے کا موقع ملا، تو اکثر ایسا دیکھا گیا کہ وہ ان توقعات پر پورا نہیں اتر سکے جو ان سے وابستہ کی گئی تھیں۔ بعض اوقات ذاتی مفادات کو ترجیح دی گئی، جس کی وجہ سے وہ عوامی امنگوں کی حقیقی ترجمانی نہ کر سکے۔

ارژنگ: آپ طب کے شعبے سے وابستہ ہیں، یہ تجربہ کیسا رہا؟ عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

عمران مشتاق: اکثر ہمارے معاشرے میں ڈاکٹر کا لفظ سنتے ہی ذہن فوراً طب (میڈیکل) کی طرف جاتا ہے، جس کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر ایک اعزازی اور علمی لقب ہے جو صرف ایم بی بی ایس یا طبی شعبے تک محدود نہیں، بلکہ پی ایچ ڈی کرنے والوں کو بھی دیا جاتا ہے۔

میرا تعلق طب کے شعبے سے نہیں ہے، بلکہ میں ایک تعلیمی اور تحقیقی میدان سے وابستہ ہوں۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، اور میرا تخصص پولیٹیکل جیوگرافی میں ہے۔ اس لیے میرے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا استعمال بطور ایک محقق اور اسکالر کے ہے، نہ کہ بطور میڈیکل ڈاکٹر۔

یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں میں پائی جانے والی غلط فہمی دور ہو سکے اور یہ شعور عام ہو کہ ڈاکٹر کا لفظ مختلف شعبوں میں اعلیٰ علمی قابلیت کی علامت بھی ہوتا ہے، نہ کہ صرف طب سے وابستگی کا اظہار۔

شعر و ادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہے؟

جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے، یہ ہماری تہذیبی اور ادبی روایت کا ایک نہایت اہم حصہ رہے ہیں۔ ماضی میں مشاعرے محض ایک ادبی تقریب نہیں بلکہ ایک زندہ سماجی تجربہ ہوتے تھے، جہاں عوام براہِ راست شریک ہو کر شاعروں کی تخلیقات سنتے، ان سے مکالمہ کرتے اور ادب کے ذوق کو پروان چڑھاتے تھے۔ یہ محافل نہ صرف تفریح کا ذریعہ تھیں بلکہ سیکھنے، سمجھنے اور ادبی شعور کو جلا بخشنے کا بھی ایک مؤثر وسیلہ تھیں۔

مگر اب سوشل میڈیا اور الیکٹرانک ذرائع نے اس روایت کو ایک نئی شکل دے دی ہے۔ آج ایک قاری یا سامع گھر بیٹھے شاعروں کی ویڈیوز دیکھ سکتا ہے، ان سے رابطہ کر سکتا ہے، اور ان کی شاعری تک فوری رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اس آسانی نے جہاں فاصلوں کو کم کیا ہے، وہیں روایتی مشاعروں کی اہمیت کو کسی حد تک متاثر بھی کیا ہے۔ مزید یہ کہ میوزیکل کنسرٹس اور دیگر تفریحی سرگرمیوں کے بڑھتے ہوئے رجحان نے بھی عوام کے ذوق میں تبدیلی پیدا کی ہے۔

اسی تناظر میں سنجیدہ اور فکری مشاعرے، جن میں ادب کی اصل روح اور گہرائی موجود ہوتی تھی، اب نسبتاً کم ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ زیادہ تر مزاحیہ مشاعروں نے لے لی ہے، جہاں اداکاری، برجستہ جملے، طنز و مزاح اور وقتی تفریح کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ مشاعرے مقبول ہو رہے ہیں، مگر ان سے وہ ادبی تربیت اور فکری بالیدگی حاصل نہیں ہوتی جو سنجیدہ مشاعروں کا خاصہ تھی۔

مزید برآں، اگر مشاعرے محض شاعروں کی باہمی نشست بن کر رہ جائیں، جہاں وہ ایک دوسرے کو کلام سنا کر رخصت ہو جائیں اور عوام کی شمولیت نہ ہو، تو پھر اس کا معاشرے پر اثر محدود ہو جاتا ہے۔ ادب کی ترویج کے لیے ضروری ہے کہ عوام، خصوصاً نوجوان نسل، ان محافل کا حصہ بنے۔

یہاں تعلیمی اداروں کا کردار نہایت اہم ہو جاتا ہے۔ اگر اسکول، کالج اور جامعات باقاعدگی سے معیاری اور بامقصد مشاعروں کا انعقاد کریں، جن میں سنجیدہ اور فکری شاعری کو بھی جگہ دی جائے، تو یقیناً طلبہ میں ادب کا ذوق پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے وہاں بھی زیادہ تر توجہ ایسے شعرا پر دی جاتی ہے جو محض تفریح فراہم کرتے ہیں، جس سے ادب کی اصل روح پس پشت چلی جاتی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ مشاعرے ختم نہیں ہوئے، بلکہ ان کی نوعیت بدل گئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان محافل کو دوبارہ اس نہج پر لے آئیں جہاں وہ نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہوں بلکہ فکری و ادبی تربیت کا بھی مؤثر وسیلہ بنیں۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے؟ کونسی کتاب خود آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟

عمران مشتاق: دیکھیے بات یہ ہے کہ میری کتابیں چودہ ہیں، جن میں شاعری کی کتابیں بھی شامل ہیں، پنجابی شاعری بھی ہے، اردو شاعری بھی ہے، ناول بھی ہے، افسانوں کی کتاب بھی ہے، بے نظیر کی شہادت کے بعد میں نے ایک کتاب لکھی، کالموں کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے، بچوں کی نظمیں بھی ہیں اور میرا انڈیا کا سفرنامہ بھی موجود ہے۔

ظاہر ہے ایک تخلیق کار کو اپنی ہر تخلیق سے محبت ہوتی ہے، اگر محبت نہ ہو تو وہ لکھے کیوں اور اسے محفوظ کیوں کرے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میری ہر تخلیق اپنی جگہ اہم ہے، مگر منیر نیازی صاحب کے ساتھ جو میری یادیں وابستہ ہیں اور ان کے جانے کے بعد جو جذبات اور تاثرات میں نے ان کے حوالے سے لکھے، وہ میرے دل کے بہت قریب ہیں۔

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف الفاظ نہیں بلکہ احساسات ہیں، یادیں ہیں اور ایک ایسی شخصیت کے ساتھ وابستگی کا اظہار ہیں جو میرے لیے بہت خاص رہی ہے۔ اسی لیے مجھے اپنی تمام کتابوں میں وہی کتاب سب سے زیادہ عزیز لگتی ہے۔

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتی ہیں؟

عمران مشتاق: تخلیق (Creation) سے مراد کسی نئے اور منفرد خیال، تصور، احساس یا چیز کو وجود میں لانا ہے۔ یہ صرف لکھنے یا فن تک محدود نہیں بلکہ سوچ، اندازِ بیان، تحقیق، شاعری، کہانی، مصوری، موسیقی اور حتیٰ کہ مسائل کے حل تلاش کرنے تک ہر اس عمل کو

CS CamScanner

تخلیق کہا جاتا ہے جس میں انسان اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو استعمال کر کے کچھ نیا پیش کرے۔

تخلیق دراصل انسان کے اندر موجود احساس، مشاہدہ، تجربہ اور سوچ کا حسین امتزاج ہوتی ہے۔ جب ایک شخص اپنے اندر کے جذبات یا باہر کی دنیا کے مشاہدات کو نئے انداز میں بیان کرتا ہے تو وہ تخلیق کہلاتا ہے۔

ارژنگ: اچھا تخلیق کار کون ہوتا ہے؟

عمران مشتاق: ایک اچھا تخلیق کار وہ شخص ہوتا ہے جو صرف نقل نہ کرے بلکہ اصل سوچ پیدا کرے اور اسے خوبصورت انداز میں پیش کرے۔۔

ارژنگ: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

عمران مشتاق: آپ نے جو سوال اٹھایا کہ ایک لکھنے والے کو تحریک اپنی ذات سے ملتی ہے یا مشاہدات سے، تو حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں عناصر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک اچھا لکھنے والا صرف باہر کی دنیا کو دیکھنے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ اندر کی دنیا کو بھی شدت سے محسوس کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر انسان کے اندر احساس کی گہرائی نہ ہو، وہ اپنے دکھ سکھ کو نہ سمجھ سکے، اپنے قریبی لوگوں کے جذبات کو محسوس نہ کر سکے، تو اس کے مشاہدات بھی سطحی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر مشاہدہ کرنے کی صلاحیت کمزور ہو تو پھر زندگی کے رنگ، معاشرتی رویے اور انسانی تجربات اس کی تحریر میں پوری طرح منعکس نہیں ہو پاتے۔

اصل میں تخلیق کا عمل تب مکمل ہوتا ہے جب ذاتی تجربہ اور بیرونی مشاہدہ ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ ایک طرف انسان اپنی ذات کے اندر اتر کر احساسات کو پہچانتا ہے، اور دوسری طرف معاشرے، لوگوں اور حالات کو گہرائی سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ پھر ان دونوں کو خوبصورتی اور سلیقے سے لفظوں میں ڈھالنا ہی اصل فن ہے۔

لہٰذا ایک کامیاب رائٹر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے اندر مشاہدے کی تیزی بھی ہو، احساس کی گہرائی بھی ہو، اور اظہار کی صلاحیت بھی۔ جب یہ تینوں عناصر یکجا ہو جائیں تو تحریر محض الفاظ نہیں رہتی بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بن جاتی ہے۔

ارژنگ: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتی ہیں؟

عمران مشتاق: ادب کی فروغ میں سوشل میڈیا کا کردار یقیناً ایک اہم اور دو دُخا موضوع ہے۔ ہر چیز کی طرح اس کے بھی مُثبت اور منفی دونوں پہلو موجود ہیں، اور اصل بات اس کے استعمال کے طریقے پر منحصر ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ سوشل میڈیا نے ادبی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ پہلے دور میں کسی ادیب یا شاعر کے لیے اپنی تخلیق کو لوگوں تک پہنچانا بہت مشکل تھا۔ محدود اخبارات، چند ٹی وی چینلز اور اشاعتی ادارے تھے، اور اگر کسی کو وہاں جگہ نہ ملتی تو اس کی آواز اکثر دب کر رہ جاتی تھی۔ بہت سے باصلاحیت لوگ صرف اس لیے سامنے نہ آ سکے کہ انہیں مواقع نہیں ملے۔

لیکن آج سوشل میڈیا نے یہ رکاوٹیں کافی حد تک ختم کر دی ہیں۔ اب ہر لکھنے والا اپنی تخلیق براہِ راست لوگوں تک پہنچا سکتا ہے۔ خاص طور پر کووڈ کے زمانے میں جب دنیا گھروں تک محدود تھی، اسی سوشل میڈیا نے کئی نئے لکھنے والوں، شاعروں اور ادیبوں کو سامنے آنے کا موقع دیا جنہیں پہلے کوئی نہیں جانتا تھا۔ یوٹیوب، فیس بک، انسٹاگرام اور مختلف ویب پلیٹ فارمز نے ادبی اظہار کے دروازے وسیع کر دیے ہیں۔

تاہم اس کے منفی پہلو بھی نظرانداز نہیں کیے جا سکتے۔ ایک طرف اگر رسائی آسان ہوئی ہے تو دوسری طرف معیار اور وقار کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔ بعض اوقات ادب کی گہرائی اور سنجیدگی کی جگہ سطحی پن نے لے لی ہے۔ سینئر ادیبوں اور شاعروں کا وہ احترام جو پہلے ایک روایت تھا، وہ بھی کسی حد تک کمزور ہوا ہے۔ اسی طرح لابی کلچر اور غیر منصفانہ پذیرائی کے رجحانات بھی بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سوشل میڈیا ادب کے لیے ایک طاقتور ذریعہ ہے، مگر اس کی افادیت یا نقصان کا انحصار مکمل طور پر اس کے استعمال پر ہے۔ اگر اسے ذمہ داری، سنجیدگی اور معیار کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ ادب کی ترویج کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔

ارژنگ: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟ کیا کھویا کیا پایا؟

عمران مشتاق: زندگی دراصل ایک مسلسل سفر ہے، جس میں ٹھہراؤ کم اور تغیر زیادہ ہوتا ہے۔ اس سفر میں خوشیاں بھی ملتی ہیں اور غم بھی، اور انسان کی خواہشات ہمیشہ اس کی پہنچ کے مطابق پوری نہیں ہوتیں۔ اسی لیے زندگی کو صرف پانے یا کھونے کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔

میں سمجھتی ہوں کہ زندگی دراصل کھونے اور پانے دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ میں نے بھی اس سفر میں بہت کچھ کھویا ہے اور بہت کچھ پایا ہے، لیکن ان سب تجربات نے مجھے نکھارا ہے، سکھایا ہے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہے۔

الحمدللہ میں اللہ تعالیٰ کی بے حد شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے اپنی رحمتوں سے نوازا۔ شاید میں ان نعمتوں کی پوری طرح مستحق بھی نہ تھی، مگر اس کی عطا ہمیشہ میرے گمان سے بڑھ کر رہی ہے۔

ارژنگ: آج کل کیا لکھ رہی ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

عمران مشتاق: آپ نے سوال کیا کہ آج کل میں کیا لکھ رہی ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ لکھنا تو ایک ایسا عمل ہے جو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ شاعری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے، کالم بھی لکھے جا رہے ہیں اور مضامین کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اس کے علاوہ ایک بہت خاص کام جس پر میں اس وقت کام کر رہی ہوں وہ اپنی والدہ صاحبہ کی بایوگرافی ہے۔ میں نے اس کا آغاز کر دیا ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ میں اسے ایک خوبصورت، سادہ مگر مؤثر انداز میں مکمل کر سکوں۔

میرے لیے یہ صرف ایک کتاب نہیں بلکہ اپنی ماں کی زندگی، ان کی قربانیوں، محبتوں اور ان کی شخصیت کو لفظوں میں محفوظ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ تحریر دل سے نکلے اور دل تک پہنچے۔

CamScanner

بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

وہ حرفِ جعفر میگزین کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں ایک فعال کردار ادا کر رہے ہیں، جبکہ گزشتہ چار دہائیوں سے نوجوان نسل کی فکری، ادبی اور سماجی تربیت میں مصروفِ عمل ہیں۔ مباحثوں، مکالموں، مشاعروں اور ادبی نشستوں کے ذریعے انہوں نے لاکھوں نوجوانوں کے اذہان کو جلا بخشی اور انہیں مثبت سمت عطا کی۔

سماجی خدمات کے میدان میں بھی ان کا کردار مثالی ہے۔ انسانی حقوق، بچوں کے حقوق، قیدیوں کی فلاح، انسدادِ منشیات، اور ماں و بچے کی صحت جیسے حساس موضوعات پر ان کی خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں۔ قدرتی آفات خصوصاً زلزلہ، سیلاب 2010 اور عالمی وبا کورونا کے دوران ان کی عملی جدوجہد انسانیت سے ان کی وابستگی کا واضح ثبوت ہے۔

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد، خدمت اور تخلیق کا استعارہ ہے۔ اگرچہ انہیں 27 بار صدارتی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا لیکن ہر بار سفارشی اور نان جینوئن لوگوں کی وجہ سے وہ اس اعزاز سے محروم رہے یہ بلاشبہ حکومت کے اداروں کی کارکردگی پہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کے مطابق ان کا اصل اعزاز عوام کے دلوں میں بسنے والی وہ محبت اور احترام ہے جو کسی بھی سرکاری تمغے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ ان کی شخصیت ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ سچی عظمت ایوارڈز میں نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت اور علم کی روشنی پھیلانے میں مضمر ہے۔

ارژنگ: آپ کی پیدائش کب کہاں اور کس خاندان میں ہوئی؟

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک: میری نمود خاک شہرِ ہنروراں سے ہوئی ہے جسے اُس زمانے میں لائل پور کہا جاتا تھا۔ پنجاب کی دریائے چناب اور دریائے راوی کے مابین واقع، ساندل بار میں بسائے اس شہر کو اب فیصل آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اگرچہ لائل پور کو فیصل آباد بنے کئی دہائیاں گزر چکی ہیں مگر اب بھی اس شہر کے بہت سے دیگر باسیوں کی طرح کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اس شہر، جہاں کی خاک سے میرا خمیر اٹھا ہے، کے نام کی اس تبدیلی نے مجھے اُسی ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی ورثے سے یک جنبشِ قلم محروم کر دیا ہے جو علامتی طور پر لائل پور نام کی شناخت میں سموئی ہوئی تھی جہاں تک تاریخ پیدائش کا معاملہ ہے تو 4 جون میری سالگرہ کا دن ہے جسے اکثر منانا بھول جاتا ہوں۔ جہاں تک شجرۂ نسب کا سوال ہے تو میرا شجرہ نسب خاندانِ بنو ہاشم سے ہوتا ہوا دیگر تمام انسانوں کی طرح حضرت آدم تک جا نکلتا ہے۔ گویا خاندانی حوالے سے آپ یوں کہہ لیں کہ اپنے آپ کو کسی تخصیص یا امتیاز سے تہی خیال کرنا میرا پسندیدہ طرزِ عمل ہے۔ میری فردیت اگر کوئی امتیاز یا پہچان چاہتی ہے تو صرف کردار کی بنیاد پر میرا ایمان ہے کہ امتیازات کی بنیاد تقویٰ'' کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

ارژنگ: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک: میں نے ایک ایسے متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم و ادب کو ایک نمایاں تہذیبی قدر کا درجہ حاصل تھا۔ لہٰذا فطری طور پر بچپن ہی سے کتاب آشنائی کے مواقع میسر ہوئے علمی و ادبی سرگرمیوں پر حوصلہ افزائی کا ماحول ملا۔ سکول لائف نے زیادہ تر کتب بینی اور بزمِ ادب کے معمولات تک محدود رکھا جب کہ کالج لائف نے اس قابل بنا دیا کہ تنظیمی حوالہ سے مختلف ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں لائے ہوئے مباحثوں، مذاکروں، مشاعروں کے اہتمام میں کوئی کلیدی کردار سرانجام [illegible]۔ اپنی عمر کے اس حصے پر نظر ڈالتا ہوں تو کل پاکستان سطح تک طلبا و طالبات کے مابین بے شمار مباحثوں اور مذاکروں کا اہتمام اپنے کریڈٹ پر پاتا ہوں۔ آج کے بہت سے مقبول تخلیق کار ایسے ہیں جن سے اس زمانے سے یاد اللہ قائم و دائم چلی آ رہی ہے جب انہیں نئے لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا تھا۔ جب کبھی ان سے صاحب سلامت کا موقع ملتا ہے اس زمانے کے مشاعروں اور مباحثوں کی بات بھی چل نکلتی ہے۔ تو وہ اعتراف پر بخل سے کام نہیں لیتے کہ ان مباحثوں، مشاعروں، مذاکروں اور مضمون نویسی کے مقابلوں نے ان کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ میں اپنے اس زمانے کے ادبی کردار پر نظر ڈالتا ہوں تو سچی بات ہے کہ آپ کو تخلیق کار کم اور ادبی تنظیموں کے منتظم کے طور پر زیادہ با اعتبار پاتا ہوں۔ حالانکہ میں اپنے کالج کے ادبی میگزین کا مدیر تھا۔ کالج کے زمانے سے کل پاکستان بین الکلیاتی مقابلوں میں اپنے تعلیمی اداروں کی نمائندگی کی اور بہت سارے انعامات کالج کی۔

CamScanner

زینت کیے۔

ارژنگ :ادب کی طرف کب اور کیسے مائل ہوئے؟

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک: میرا ادبی میلان قطعاً کوئی حادثاتی معاملہ نہیں ہے کہ کسی خاص واقعے نے اچانک مجھے متاثر کرتے ہوئے اس راہ پر ڈال دیا ہو۔ میں اگر اس حوالہ سے اپنا تجزیہ کروں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ میلان مجھے فطرت ہی کا عطا کردہ ہے۔ اتفاق سے مجھے ماحول بھی ایسا میسر آیا کہ اس میلان کو میرے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ تاہم کالج کے زمانے تک لکھنے لکھانے کا سلسلہ اپنی تخلیقات حلقہ دوستاں سے شیر کرنے تک محدود رہا۔ اس زمانے کے شاید چند ایک رسائل کے ادبی صفحات ہی گواہی دے پائیں کہ مجھے اشاعت پذیری کی کوئی خاص پرواہ رہی ہو۔ تاہم جب میں عملی زندگی میں داخل ہوا تو مختلف ادبی رسائل میں تواتر سے شائع ہونے والے احباب نے مجھے خصوصی طور پر اس جانب راغب کیا۔ اب بھی آپ اسے میری فطری کوتاہی کہ لیں کہ تخلیقات مہینوں یونہی پڑی رہتی ہیں۔ اشاعتی حوالہ سے کسی میگزین کو اصرار کے باوجود بھجوانے کی توفیق نہیں ہو پاتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا تخلیقی عملیہ خود کو کسی اشاعتی ضرورت سے مشروط نہیں رکھتا۔

ارژنگ: پہلی کتاب کون سی تھی اور کب شائع ہوئی؟

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک: خالصتاً ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو نئے دنوں کے خواب "ایسا شعری مجموعہ ہے کہ جو اشاعتی حوالہ سے میری شعری تخلیقات کو منظر عام پر لانے کا سبب بنا۔ اس حوالہ سے آپ اسے میرا اولین شعری مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں جو اگر میں بھول نہیں رہا ہوں تو 2000ء میں منظر عام پر آیا۔ بعد ازاں 2007ء میں "دریا سے صحرا تک" سفرنامہ دبئی اور 2020ء میں "اپنے استنبول میں" کے نام سے سفرنامہ ترکی طبع ہوا۔ 2011ء میں تنہا رہنا سیکھ لیا ہے کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ اشاعت پذیر ہوا۔ جب کہ "کیسپر کے دیس میں" کے نام سے سفرنامہ آسٹریا، " ساحل سے ساحل تک" کے نام سے سفرنامہ سری لنکا اور "ریزہ" کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ اور "اے ارض لبنان" شامل ہیں۔ یہاں میرے لیے اپنی دو تین ایسی کتابوں کا ذکر شاید بے معنی یا بیجا نہ ہو جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے سوشل ورکر کے طور پر میرے کردار کو شباہت دینے میں معاون رہی ہیں۔ ان میں میں نے نشہ چھوڑ دیا علم المنشیات اور سحر قریب ہے کے نام سے اشاعت پانے والی کتابیں شامل ہیں جن کا زمانہ اشاعت 1990ء سے 2000ء تک ہے۔ یہ کتابیں ڈرگ ایڈکشن کے خلاف بطور سماجی کارکن میری جدوجہد کے تناظر میں منشیات کی نوعیت، ان کے اثرات، تدارک، علاج اور ان سے پیدا کرنے والے سماجی مسائل کے موضوعات سے بحث کرتی ہیں۔ تاہم میں نہیں سمجھتا کہ انہیں

کسی بھی طور پر ادبی زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ "حرف جعفر" کے نام سے ایک ماہنامہ پچھلے پندرہ سولہ سال سے مسلسل شائع کرنے کا سزاوار بھی ہوں جس کی نوعیت نیم سماجی، نیم ادبی ہے۔

ارژنگ: سفرنامہ لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور اب تک کتنے سفرنامے شائع ہو چکے ہیں؟

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک: میں خود کا شمار ایسے لوگوں میں کرتا ہوں جن پر "سفر کا پاؤں پر لکھا ہونا" کا محاورہ صادق آتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جب سے عملی زندگی کا آغاز ہوا ہے کبھی نجی اور کبھی پیشہ ورانہ حوالے سے وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی سفر ہمیشہ در پیش ہوتا ہے۔ جناب منیر نیازی کے ایک شعری مضمون کی طرح ایک دریا کے پار اترنے پر ایک اور دریا کا سامنا ہوتا ہے۔ ہر نئی سمت کا سفر حسی اور فکری سطح پر نئے تجربات اور تازہ محاصل کا ماخذ ہوتا ہے۔ میرے علمی آغاز میں میرے اسفار کے حسی اور فکری محاصل غزل نظم، افسانے کی تخلیق کا محرک بنتے رہے۔ بعد ازاں میرے حلقہ ادب کے احباب نے اصرار کیا کہ میں اپنے سیاحتی تجربات کو تخلیقی روداد کی صورت میں سامنے لاؤں۔ چونکہ افسانہ، ناول، تنقید، شاعری کی طرح اُردو ادب میں لکھے گئے بیشتر سفرنامے بھی میری مطالعاتی دستبرد سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ اس لیے مجھے سفرنامے کے ادبی معیارات کا ادراک رکھنے میں کچھ ایسا مسئلہ در پیش نہیں ہوتا۔ سو احباب کے اصرار پر میں نے اپنی سی کوشش کی۔ "دریا سے صحرا تک کی صورت" میں دوبئی کا سفرنامہ منظر عام پر آیا۔ تو احباب کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی جانب سے بے پناہ پسندیدگی ملی تو قلم اس ڈگر پر چل نکلا اور اب صورت یہ ہے کہ اپنے سفر کا سفرنامے کی صورت میں تخلیقی بیان حسی اعتبار سے میرے لیے بہت طمانیت کا باعث بنا ہے۔ اب تک کئی سفرنامے دریا سے صحرا تک (سفرنامہ دبئی) اور اپنے استنبول میں (سفرنامہ ترکی) منظر عام پر آچکے ہیں جب کہ کیسپر کے دیس میں سفرنامہ آسٹریا و دیگر شامل ہیں جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں زمانہ۔ پچھلے کچھ عرصہ سے میں نے ادبی حوالہ سے اپنے بکھرے ہوئے تخلیقی کام کو سمیٹ

کر اسے مطبوعہ شکل میں لانے کی کوشش ہے۔ ایک پلندے کو سمیٹتا ہوں تو ایک اور کو بکھرا پاتا ہوں پھر اسے سمیٹنے میں لگ جاتا ہوں۔ میرے ساتھ تو ایک عرصہ سے یہی واردات چل رہی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے آپ کا زمانہ حال آپ کے مستقبل کا تخلیق کار ہوتا ہے۔ میں اپنے مستقبل میں کسی ایسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں رکھتا جو میرے زمانہ حال سے مماثل نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے پاس کچھ بہتر کرنے کی استعداد ہے تو وہ زمانہ حال ہی میں ہے۔

ارژنگ: فیصل آباد کی ادبی فضا کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مستقبل میں کون سے شاعر اس شہر کی پہچان بنیں گے؟

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک: ادبی حوالہ سے فیصل آباد کی مٹی ہمیشہ بہت زرخیز رہی ہے۔ اس شہر ہنروراں نے ایسے ایسے ہنرور پیدا کیے ہیں کہ جن کی فکری وفنی اپج اور کمال کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ ن م، راشد کا تعلق اسی خطہ زمین سے تھا۔ سلیم بے تاب، جوہر جالندھری، حافظ لدھیانوی، عبیر ابوذری، شوق عرفانی، احسن زیدی، شہزادہ حسن، قمر لدھیانوی، طالب جالندھری، افتخار نسیم، عدیم ہاشمی، ممتاز کنول، خاور زیدی، نذر جاوید، اقبال اختر ایسے شعرا ہیں کہ جو اب ہم میں نہیں ہیں۔ مگر ان کا شعری آہنگ فیصل آباد کے مجموعی شعری آہنگ کو ایک مخصوص شناخت دینے میں کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ افضل احسن رندھاوا، ڈاکٹر ریاض مجید، افسر ساجد ایسے نام ہیں جو عالمی ادبی منظر نامے پر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ارشد جاوید، قیوم ناصر، افضل خاکسار، احمد شہباز خاور نصرت صدیقی، اشرف یوسفی، کوثر علی، خاور جیلانی، انجم سلیمی، ظفر عجمی، مقصود وفا، علامہ ضیا حسین ضیاء، شاہد اشرف، ثناء اللہ ظہیر، راشد اقبال، کاشف نعمانی محمود رضا سید، منصف ہاشمی علی زریون اور سردار آصف آرائیں کا شمار عمدہ اشعار کہنے والوں میں ہوتا ہے کہ فیصل آباد کے شعری شباہت کے رنگ انہی کی تخلیق کارفرمائی کے مرہون ہیں۔ افضال نوید، شہزاد اسلم گو بیرون ملک جاتے ہیں مگر یہاں کی شعری فضا آج بھی ان کا حوالہ پا کر خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔ شہزاد بیگ، اشفاق بابر، یاور نقوی، اشرف اشعری عہد جاریہ کے ایسے فعال نام ہیں کہ جس کی ادبی فعالیت حیران کر دینے کا نامہ رکھتی ہے۔ اُردو افسانے کی تخلیق کے باب میں طاہرہ اقبال اور گلزار ملک کے مؤقر ادبی جرائد میں اپنی جگہ بناتے، اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔ نثر و شاعری کے حوالہ سے خواتین کے کردار کا تذکرہ کیا جائے تو محترمہ گلفام نقوی محترمہ کنیز اسحاق محترمہ نسیم صحرائی محترمہ ضیاء بتول، محترمہ فوزیہ ہاشمی محترمہ عنبرین اشعر محترمہ رابعہ سرفراز محترمہ فرحت صدیقی، محترمہ ناز فاطمہ محترمہ سعیدہ ہاشمی اور محترمہ رفعت یاسمین فیصل آباد کے نسائی ادب کو پہچان دینے میں اہم کردار سرانجام دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر سہیل عباس، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر آصف اعوان، ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر اصغر علی بلوچ کے نام اہم ہیں۔

فیصل آباد کے منتخب شعراء و ادباء کی مندرجہ بالا فہرست کو اگر ادبی حوالہ سے تخلیقی صلاحیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بے اختیار زبان پر۔۔۔۔۔

ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

کا مصرعہ جاری ہو جاتا ہے۔

ارژنگ: قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک: عصری ادب کی فعالیت کے حوالے سے عموماً سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ آج کا ادب قارئین کو متوجہ کرنے سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میں اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں رکھتا۔ آج کا ادب اپنے قاری سے اتنی ہی کشش رکھتا ہے جتنی کلاسک ادب اپنے قدیم قاری کے لیے رکھتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کا قاری اپنے ناقدانہ ردعمل کو اظہاری رویے میں ڈھالنے کے ذوق سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کتاب سے استفادے کے باوجود اپنی ریڈرشپ کے ماحصل کو خارج از بیان کر دینے کے رویے نے خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو، کتاب کی مطالعاتی رغبت کو تحرک دینے میں رکاوٹ پیدا کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاری کا مطالعہ اسے جو بھی نتائج دے، ان کے اظہار سے مباحث کو اپنا جواز پانے کا موقع ملتا ہے اور علمی و ادبی تحرک انہی مباحث ہی سے اپنا وجود پاتا ہے۔ میں قارئین ادب سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنی آراء خود تک محدود رکھنے کی بجائے اسے مکالمے کا جواز دیں گے کہ ادبی جمود کے خاتمے کی یہی تہذیب سے ہے۔

⊙⊙⊙

اگرچہ ایک ہی جیسے سفر ہمارے ہیں
کنارے اُن کے لیے ہیں بھنور ہمارے ہیں
خوشی بہت ہے کہ شام و سحر ہمارے ہیں
ملال یہ ہے، فقط لحہ بھر ہمارے ہیں
اُدھر یہ سازشیں، ہم سے زمیں بھی چھن جائے!
ہمیں یہ زعم کہ شمس و قمر ہمارے ہیں
کسی کے نام سے منسوب ہے نئی بستی
مگر جو شہر ہوئے ہیں کھنڈر، ہمارے ہیں
جو لفظ شعر میں برتیں، وہ زندگی پائے
عجیب سوچیں، انوکھے ہُنر ہمارے ہیں
سماعتوں نے جو اُن کو قبولیت بخشی
یقیں ہوا کہ سُخن معتبر ہمارے ہیں
ہمارے فیض سے پھولے پھلے کئی گلشن
درخت سارے مگر بے ثمر ہمارے ہیں
اِنہیں گرانے سے پہلے یہ سوچ بھی لینا!
ہمارا گھر ہے، یہ دیوار و دَر ہمارے ہیں
ہمارے ہاتھ میں پتھر ہیں اور سَر میں جنوں
کمال یہ ہے کہ شیشے کے گھر ہمارے ہیں
نسیم وہ جو ہمارے قریب آتے نہیں
ہمارے ہو نہیں پائے، مگر ہمارے ہیں!

نسیم سحر/راولپنڈی

منظر سے مَیں ہٹا تو ہَوا تیز ہو گئی
بجھنے لگا دِیا تو ہَوا تیز ہو گئی
دروازہ بند ہونے سے کمرے میں حبس تھا
دروازہ جب کھُلا تو ہَوا تیز ہو گئی
گھر میں بھی دل کے شور نے رُکنے نہیں دیا
باہر قدم رکھا تو ہَوا تیز ہو گئی
مَیں سُن رہا تھا دیر سے اُس کی شکایتیں
مَیں بولنے لگا تو ہَوا تیز ہو گئی
بکھرا ہوا تھا چاروں طرف مَیں بُری طرح
جب کچھ سمٹ چکا تو ہَوا تیز ہو گئی
پوچھا گیا: یہ کون تھا اِتنا سُبک خرام؟
مَیں نے کہا ہَوا، تو ہَوا تیز ہو گئی
سب کے دیئے منڈیروں پہ روشن رہے نسیم
میرا دِیا جلا تو ہَوا تیز ہو گئی!

نسیم سحر/راولپنڈی

لارے پہ لگا کر وہ کمینہ نہیں آیا
دو دن کا کہا اور مہینہ نہیں آیا
جس روز جزیرے پہ بہت ڈھول کھلے تھے
اُس شام اِدھر کوئی سفینہ نہیں آیا
جاتے ہیں ولایت ترے کاڑھے ہوئے تکیے
لیکن مرا سینہ تجھے سینا نہیں آیا
دس بار بچھڑنے کا کیا تجربہ اس نے
پر اس کو بچھڑنے کا قرینہ نہیں آیا
پیروں کے تلے روند دیے پھول اور اس کو
ماتھے پہ ذرا سا بھی پسینہ نہیں آیا
کیا کیا نہ بتایا ترے احباب نے مجھ کو
اس دل میں ترے واسطے کینہ نہیں آیا

انعام کبیر

میں پانیوں میں بہا کر چراغ کیا کرتا
یوں آرزو کے جگا کر چراغ کیا کرتا
مجھے خبر تھی پلٹ کر اسے نہیں آنا
سو ساری رات جلا کر چراغ کیا کرتا
میں اپنے خون سے کرتا ہوں راستے روشن
کسی کا جلتا اٹھا کر چراغ کیا کرتا
ازل سے بہری ہے ظالم، کبھی نہیں سنتی
ہوا کو حال سنا کر، چراغ کیا کرتا ہے
میں اپنی کرب و بلا میں اکیلا آیا تھا
درون خیمہ بجھا کر چراغ کیا کرتا

بدر سیماب/میاں چنوں

جیسے دستک پہ کسی گھر کا فسوں ٹوٹتا ہے
آئینہ روز مرے سامنے یوں ٹوٹتا ہے
سانس لیتا ہوں تو شریانیں سنبھل جاتی ہیں
آہ بھرتا ہوں تو کچھ دل کے دروں ٹوٹتا ہے
قابو اعصاب پہ رکھ ہجر کا رونا مت رو
آنکھ بہتی ہے تو پھر شوقِ جنوں ٹوٹتا ہے
کوزہ گر کھول گرہ تاکہ سبھی جان سکیں
دستِ حیرت سے جو بنتا ہے وہ کیوں ٹوٹتا ہے
تیرے آنے پہ نکھرتے ہیں رخِ برگ و گلاب
تیرے جانے پہ رگ و پے کا سکوں ٹوٹتا ہے

اسد رضا سحر/جھنگ

شکوۂ بے گھری تمام کرے
آئے دل میں ابھی قیام کرے
آنے والے ہیں دن مصیبت کے
رزقِ گریہ کا اہتمام کرے
آنکھیں ٹکرا رہی ہیں آنکھوں سے
اب تو بولے وہ کچھ کلام کرے
پہلے آنکھوں کا دبدبہ دیکھے
اور پھر تیغ بے نیام کرے

بادشاہت سے کب کسے فرصت
حکمرانی کوئی غلام کرے
بے یقینی سی خود پہ ہونے لگے
کوئی ایسے نہ احترام کرے

اسد رضا سحر/ جھنگ

چند ایک مسافر بھی مرے سنگ چلے ہیں
ہم، آرزوئیں ساتھ لیے جھنگ چلے ہیں
ہم عشق سے گوندھی ہوئی مٹی کی مہک کو
ترسے تھے سو اب، خطۂ نورنگ چلے ہیں
بے رنگ مناظر تھے، تخیل کے جہاں کے
قوسِ قزح خلد سے کچھ رنگ چلے ہیں
اک کن پہ جو تیری مرے معبود، بنے تھے
حکمت پہ ہی تیری مرے ارژنگ چلے ہیں
اے مہر و مروت کے خدا تیرے جہاں میں
روتے ہوئے آئے تھے اور دنگ چلے ہیں
ان میرے مکاتیب کا کچھ کر مرے مالک
جو میری طرف سے تجھے بیرنگ چلے ہیں
سننے میں یہ آیا ہے کہ طوفان کے لشکر
کرنے کو کسی دیپ سے پھر جنگ چلے ہیں

شہزاد دیپ/ جھنگ

تلخ حقیقت

(نظم معرّیٰ)

تلخ ہے یہ مگر حقیقت ہے
بعد مرنے کے تو جنازے میں
کم ہی دیکھی گئی سدا شرکت
جیتے جی تک ہیں چاہنے د ـــ
جیتے جی تک ہیں سلسلے سارے
شاعروں کے کئی ادیبوں کے
فلمی دنیا کے ہوں کہ تھیٹر کے
میں نے دیکھے بہت جنازے ہیں
پانچواں شخص بھی نہیں ہوتا
خود فریبی ہی خود فریبی ہے
بھول انجام مت کبھی جانا
عارضی سلسلے بھی عاصم
عارضی شہرتیں بخاری جی

عاصم بخاری/ میانوالی

طوائف

زندگی سے ہار کر
جب بھی میں اس کے پاس آیا
اس نے اپنا دل مرے قدموں میں رکھا
چھت پہ ڈالی چارپائی پر نئی چادر بچھائی
بال کھولے، جسم پر خوشبو لگائی،
روح میں سانسیں بھریں
اور زندگی دی
اپنی ساری روشنی مجھ میں انڈیلی،
آخری بوسے کی لذت کے نشے سے چور کر کے
چل پڑی،
چھت سے اتری
تو نئی دنیا تھی اس کی منتظر،
صحن میں لٹکی ہوئی تاروں پہ کپڑوں کو سکھانے کے
لئے ڈالا تو پھر سے مسکرائی،
شام کو کمرے کی بے ترتیب اشیا کو نئی ترتیب دی
آئنے میں خود کو دیکھا، مسکرا کر خود سے بولی
میں وہ عورت ہوں کہ جس نے جنگلوں کے
وحشیوں کو خواہش تعمیر بخشی
آدمی کو اک نئی تہذیب دی

حسن جمیل/ واہ کینٹ

ہمارے گاؤں کی ٹوٹی ہوئی سڑک

ہمارے گاؤں کی ٹوٹی ہوئی سڑک اب تک
نہ جانے کتنے حوادث کو خود پہ جھیل چکی
نہ جانے کب سے وہاں قتل ہوتے آئے لوگ
لہولہان رہی، گولیوں سے کھیل چکی
ہمارے گاؤں کے بچوں کے پاس علم نہیں
وہاں کے لوگ تہہ آب دیکھتے ہی نہیں
انہیں تلاش فقط رزق ہی کی رہتی ہے
سوائے اس کے کوئی خواب دیکھتے ہی نہیں
ہمارے گاؤں کی عورت جو صرف باندی ہے
اسے حقوق سے مطلب نہ فرض کا معلوم
وہ ایک ڈھور کی صورت ہنکائی جاتی ہے
نہ جس کے حسن کے چرچے، نہ عشق ہی مقسوم
ہم اپنے گاؤں سے دور ایک شہر کے باسی
کبھی کبھی یونہی اس راہ سے گزرتے ہیں
تو سوچتے ہیں یہاں لوگ پچھلی صدیوں کی،
ابھی تلک اسی شاہراہ سے گزرتے ہیں
یہ لوگ روشنی پائیں گے علم کی کب تک
ہمارے گاؤں کی ٹوٹی ہوئی سڑک اب تک

حسن جمیل/ وا کینٹ

لی چھون

بارش کی ہلکی پھوار
سوندھی مہکار
پتوں سے اٹھتا سبز دھواں
نیلگوں سماں
جھیل میں بہتی چاندنی
تھرکتی راگنی
پانی میں پرندوں کا عکس
طلسمی رقص

برف سے ڈھکی وادی
گم سم آبادی
آتش دان میں سلگتے انگارے
دہکتے شرارے
آنچل سے کھیلتی ہوا
سنہری گھٹا
چلتی ریل سے اڑتی دھول
سرسوں کے پھول
موگرے کی خوشبو
آنکھ میں آنسو
ٹمٹماتے چراغ
سسکتے داغ
آئینے سے شرماتا نکھار
کھڑکی سے جھانکتی بہار

لی چھون : چینی اصطلاح ہے جس سے مراد بہار کے آغاز کا تہوار ہے۔

قندیل بدر/کوئٹہ

"چومنا محبت ہے"

آپ نے چوما مجھے
تو میرے دل کی ڈال پر
رنگ رنگ کھل گیا
مصوری کا ایک ڈھنگ
آنکھ میں اُتر گیا
دل تو اُف دھڑک گیا
دھڑک گیا بہک گیا
کہ چومے جا رہے تھے وہ
کہ پھول کھلتے ہی گئے
کہ جسم و جان مہک گئے
کہ پھول بنتے جا رہے تھے
روح میں نگاہ میں ـ ـ ـ ـ ـ
پیار کو محسوس کر کے
اُنگ اُنگ کھل گیا
کھل گئی یہ روح بھی

کہ آپ مجھ کو مل گئے

یقین جانیے حضور
پھول سارے کھل گئے
کہ سوچیئے مجھے لگا
مجھے لگا میں پھول ہوں
جو آپ میں مہک گیا
مہک گیا دھڑک گیا
یہ جاں یہ دل کا بانکپن
محبتوں میں ڈھل گیا
مجھے لگا یہ میں نہیں
مجھے لگا میں پھول ہوں
میں پھول ہوں تو جانیے!!
میں کتنی عمر پاؤں گی؟
مگر میں آپ میں کہیں
سدا مہک اُٹھاؤں گی

فائزہ صابری نوا

سرگوشیاں

میں رات کے پچھلے پہر
کمرے کو تنہا چھوڑ کر
یادوں کی چادر اوڑھ کر
اُنگلی پکڑ کے چاند کی
جاتا ہوں جب تیری گلی
کوچے کی اس پل خامشی
اور تیرے گھر کی روشنی
کرتے ہوئے سرگوشیاں
کہتی ہیں میرے کان میں
کچھ اس طرح
سچ سچ بتا
پوچھیں جو تجھ سے ماجرا
اتنا بڑا یہ شہر ہے
لیکن ترا شوقِ نظر
ہر بار کیوں جائے ٹھہر
جب بھی ہوایاں سے گزر
ہر بار ان کا یہ سوال
مسکا کے میں دیتا ہوں ٹال
تیرے در و دیوار میں نا آشنا
غم سے پیا!
کیسے میں ان کو دوں بتا
یاں پر لٹا
چاہت کا اپنا قافلہ

عامر بن علی/ جاپان

لمحہ لمحہ بکھر رہے ہیں لوگ
یعنی قسطوں میں مر رہے ہیں لوگ
زیست دوزخ ہے زیست جنت ہے
دونوں جانب اُتر رہے ہیں لوگ
راستے گرد گرد ہیں سارے
اور اُن سے گزر رہے ہیں لوگ
کیسے ہجرت پہ ہو گئے مجبور
جس جگہ عمر بھر رہے ہیں لوگ
خوف پھیلا ہے ایسا گلیوں میں
اب گھروں میں بھی ڈر رہے ہیں لوگ
زندگی اس طرح گزارتے ہیں
جیسے تاوان بھر رہے ہیں لوگ
لُبنیٰ اس کا حساب تو ہوگا
یہاں جو کچھ بھی کر رہے ہیں لوگ

لُبنیٰ صفدر/ لاہور

نقش فریادی ہمارے عہد میں

عامر بن علی / جاپان

بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کی عامیانہ گفتگو پر تنقید مقصود نہیں ہے، مگر بڑے انسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عام سے موضوع پر بھی عمومی سی بات کرتے ہیں تو اس میں بھی دانش کا کوئی پہلو نکل آتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ازبس ضروری ہے کہ میں بڑا آدمی اسے سمجھتا ہوں جو علم وحکمت میں افضل ہو۔ مال ومتاع کی فراوانی بڑے پن کے لئے ناکافی سامان ہے۔ اس تمہید کا سبب میرے زیر مطالعہ ایک تازہ تازہ شائع شدہ کتاب ہے۔ اس کتاب کا عنوان انگریزی زبان میں ہے مگر تحریر اردو ہے۔ Facing History With Facebook ایک جدید خیال ہے، متنوع موضوعات پر مشاہیر کی مستند رائے کو جدید پیرائے میں بیان کرنا جیسے وہ تاریخی شخصیات خود فیس بک کی صارف ہوں اور بنفس نفیس اپنی رائے پیش کر رہی ہوں۔ امجد محمود چشتی ایک منجھے ہوئے لکھاری اور ایک مقبول مزاح نگار ہیں جن کی اب تک متعدد کتب شائع ہو کر سند قبولیت حاصل کر چکی ہیں، مگر زیر نظر کتاب سب سے خطرناک ہے۔ چونکہ مصنف بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں اس لئے تحریر میں شگفتگی بھرپور ہے اور انداز بیان بھی انتہائی تخلیقی ہے، موضوعات مگر ایسے ہیں جیسے تنے ہوئے رسے پر چلنا۔ ذرا سا توازن بگڑا تو دھڑام ہونے کا ہر دم اندیشہ مگر اس مشکل امتحان میں امجد محمود چشتی یوں سرخرو رہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے تو ایک جملہ بھی کسی موضوع پر بطور رائے رقم نہیں کیا۔ جن مشاہیر کی رائے بیان کی گئی ہے وہ تاریخ میں پہلے سے درج اور مصدقہ ہے۔ جسے بآسانی ریکارڈ سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ تخلیق کار کی بنیادی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہجوم سے ہٹ کر سوچتا ہے، ان امکانات کا بھی جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے جن پر ان کا عہد ابھی تک غور کرنے پر بھی مائل نہیں ہوتا۔ امجد محمود چشتی نے وہ کام کر دکھایا ہے جہاں مصنوعی ذہانت شاید کئی سال بعد پہنچے کہ کسی مخصوص موضوع پر مشاہیر کی رائے کیا ہے؟ انداز ایسا جاذب نظر اور طرز تحریر اتنا دلچسپ ہے کہ قاری کو جکڑ لیتا ہے اور کتاب مکمل کئے بغیر چھوڑنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ مصنف کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کا عدم تعصب ہے، خاص طور پر مذہبی موضوعات کو قلمبند کرتے ہوئے ان کی یہ خوبی نمایاں نظر آتی ہے۔ مجھے اس کتاب میں مزاح کے ساتھ ساتھ تعلیم کا پرچار اور انسان دوستی بھی چھلکتی نظر آتی ہے۔ مارک زوکر برگ نے فیس بک ایجاد کرتے ہوئے یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس کے سماجی رابطے کے لئے بنائے گئے اس فورم کا کوئی سخن ور ایسا تخلیقی استعمال بھی سوچ سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فیس بک ایک آن لائن فورم ہے۔ مگر مصنف نے اس برقی کتاب کو ورقی کتاب میں ڈھال کر ایک نئی جہت متعارف کروا دی ہے۔ ساہیوال کے معروف اشاعتی ادارے انور سنز پبلشرز نے اسے انتہائی معیاری کاغذ پر شائع کیا ہے۔ ساہیوال پرنٹنگ پریس نے اعلیٰ طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ جاذب نظر سرورق سامعہ مریم اور تخلیقی لے آؤٹ اختر خان کی محنت ومحبت کا ثبوت ہے۔ محمد عبداللہ چشتی کی نظر ثانی نے اس کتاب کو مزید جلا بخشی ہے۔ تین سو اڑسٹھ صفحات کی اس دلچسپ کتاب کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ کتاب اپنے خریداروں کو مایوس نہیں کرے گی۔ میری اس رائے کی وجہ سخن فہمی کے علاوہ غالب کی طرفداری بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ مصنف کا اور میرا آبائی علاقہ ایک یعنی میاں چنوں ہے۔ تفنن برطرف، موضوعات کا ایسا تنوع آپ کو آج کل کے تخلیق کاروں میں کم کم ہی نظر آئے گا۔ حیات غالب اور ذکر اقبال سے بات شروع کرتے ہیں۔ وارث شاہ اور امرتا پریتم سے ہوتے ہوئے محی الدین ابن عربی اور مولانا طارق جمیل تک موضوع سخن نظر آتے ہیں۔ کتاب میں درج کی گئی بحث کے عنوانات انتہائی دلچسپ ہیں، مسائل تصوف، انسان اور کائنات، خوابوں کا بیان، حقوق نسواں۔ غرض کہ نظریہ وحدت الوجود سے لے کر بیانات حور تک ایک قوس قزح ہے جو نمودار ہوتی نظر آتی ہے۔ مصنف کی بزلہ سنجی اور فنکارانہ مہارت قابل داد ہے۔ مگر مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ خوبی کہ تعصب اور نفرت کی ایک جھلک بھی اس تحریر میں نظر نہیں آتی۔ اس نفسا نفسی کے دور میں انسان کا اپنی بچوں جیسی شرارت اور معصومیت وحیرت کو برقرار رکھنا ایک کرشمے سے کم نہیں ہے اور مصنف اس امتحان میں کامیاب وکامران نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب اردو ادب کے دامن میں ایک خوشگوار اضافہ ہے اور اہل وطن کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ جس طرح اچھی جسمانی صحت کے لئے اچھی خوراک ضروری ہے، بالکل ویسے ہی ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے اچھی کتاب اور مثبت علم ضروری ہے، چونکہ انہی سے پھر مثبت سوچ جنم لیتی ہے جو کہ ایک اچھے معاشرے کی بنیاد ہے۔

بہادر شاہ ظفر

مرزا کاظم رضا بیگ

بہادر شاہ ظفر خاندان مغلیہ کے آخری یادگار تھے۔ان کی زندگی کے المناک واقعات پڑھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے۔ دلی کے غدر میں عزیز و اقارب کا قتل ہونا، تخت و تاج سے معزولی، جلاوطن کیے جانا، رنگون میں غربت عسرت میں آخری ایام بسر کرنا ایسے عبرتناک حالات ہیں کہ آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں اور ایک حسرت و یاس کی تصویر نظروں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔

28 شعبان سنہ 1189ھ مطابق سنہ 1775ء کو منگل کے دن شاہ عالم کے دوسرے بیٹے مرزا اکبر شاہ کی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔خوشی کے شادیانے بجے اور طرب کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔

مرزا ابوظفر نے جب ہوش سنبھالا تو شاہزادوں کی طرح ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔قرآن پڑھانے کے لیے اس زمانے کے مشہور قاری حافظ محمد جلیل مقرر ہوئے۔اتالیقی کا منصب گرامی حافظ ابراہیم کو عطا ہوا اور ان کے بعد انہی کے بیٹے حافظ بقا اللہ رس عہدہ پر فائز رہے۔ ہندوستان کے مشہور خوشنویس سید جلال الدین حیدر کے والد نے تحریر کی مشق کرائی۔ شاہزادے نے خط نسخ و نستعلیق میں ایسی مہارت بہم پہنچائی کہ اُستاد ہو گئے۔عربی کی تعلیم حاصل کی۔فارسی انشا پردازی پر کامل عبور حاصل کیا۔ تیراندازی، شہسواری اور تیغ زنی میں ملکہ حاصل تھا۔نشانہ بازی اور بندوق چلانے میں اتنا کمال تھا کہ قلعہ کے مرشد زادوں کو ان فنون کی بذاتِ خود تعلیم دیتے تھے۔ غرضیکہ تمام مروّجہ علوم و فنون ان کو سکھائے گئے۔ شاعری کی طرف زمانہ طفلی ہی سے میلان تھا۔

مولانا فخر الدین چشتی ایک صوفی منش متقی اور پرہیزگار بزرگ دلّی میں تھے۔ بادشاہ، شہزادے اور بیشتر اراکین سلطنت ان کی حرمت کرتے تھے۔مرزا ابوظفر حصولِ فیض کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔مولانا نے ان کی پیشانی پر آثار ہوش مندی ملاحظہ فرما کر دستار بندی سے مشرف فرمایا۔گویا کہ درپردہ تاج سلطنت کی بشارت دی۔ بہادر شاہ نے مختلف طریقوں سے اس بات کو شاعری کا لباس پہنا کر ظاہر کیا ہے۔

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

ہندوستان میں اس وقت طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ دکن میں مرہٹے قتل و خوں کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت ترقی پر تھی۔ایسٹ انڈیا کمپنی آہستہ آہستہ آپس کی پھوٹ سے فائدہ اُٹھا کر اپنا اثر و اقتدار بڑھا رہی تھی۔نواب اودھ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ مغل سلطنت کی شوکت و قوت ختم ہو چکی تھی۔صرف نام کو شہنشاہی رہ گئی تھی، جس کو کبھی انگریز اور کبھی مرہٹے اپنے حصولِ مقصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چغتائی تلواروں کی دھاک کا اثر زائل ہونے کے بعد شاہی عظمت و وقار خاک میں رونداجا رہا تھا۔ شاہ عالم ثانی دلی کے تخت پر رونق افروز تھے، لیکن بخت سیاہ کی تاریکیوں میں اس ماند چراغ کی روشنی دلّی اور اس کے مضافات میں سرِ پنج پنج کر رہ جاتی۔اس وقت مرزا ابوظفر کی عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ تیموری شاہزادے ملکی معلومات سے بے تعلق ہو کر اپنا وقت عیش و طرب میں ضائع کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ ضابطہ خان کے لڑے غلام قادر نے باپ کے مرنے کے بعد جاگیر پر قبضہ کر لیا اور مرہٹوں کو دکن میں مشغول پا کر دلّی پر چڑھائی کر دی۔ بیگمات کی بے حرمتی کی اور شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں خنجر کی نوک سے نکلوانے کے لیے سلیم گڑھ میں قید کیا۔ابوظفر نے اگرچہ انقلاب روزگار کے خوب خوب تماشے دیکھے، لیکن اس حسرت ناک واقعہ نے دل پر کچھ ایسے زخم لگائے کہ تمام عمر ہرے رہے اور وہ اندوہ و حسرت، غم و عبرت جو اس وقت ان کے دل میں پیدا ہوئے، آخری وقت تک زبانِ قلم سے ظاہر ہوتے رہے ہیں۔

تماشے گردشِ دوراں نے ہم کو خوب دکھلائے
ہوا کیا کیا ہمارے انقلاب آنکھوں کے آگے ہے

مادھوجی سندھیا کے مرنے کے بعد جب مرہٹوں کو انگریزوں نے شکست دی تو شاہ عالم مرہٹوں کے اثر سے نکل کر انگریزوں کے تسلط میں آ گئے۔1803ء کو جنرل اکٹرلونی نے دلی پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہی عملہ موقوف ہوا اور انگریزی افسر نگراں مقرر ہوئے۔دریائے جمنا کے کنارے کے قطعات، زمین جس قدر گرد و نواح دلی میں شامل ہو سکتے ہوں شاہی خاندان کی پرورش کے لیے مقرر ہوئے۔بادشاہ کی مالی حالت درست ہوئی اور جان و مال کے خطرے سے قدرے سکوں ملا۔مرزا ابوظفر نے بھی اپنی زندگی کے یہ چند سال بڑی بے فکری سے بسر کیے۔اس دور کی شاعری ان کے اطمینان اور عیش و راحت کی شاہد ہے۔فرماتے ہیں:

جام ہے، شیشہ ہے، ساقی بھی ہے، برسات بھی ہے
ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے
وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشے میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف و عنایات بھی ہے

18 نومبر سنہ 1806ء کو شاہ عالم ثانی نے انتقال کیا تو ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی اپنے والد کی وفات کے بعد رمضان سنہ 1221ھ میں تخت پر بیٹھے۔اگرچہ خلف اکبر مرزا ابوظفر ولی عہدی کے حق دار تھے، لیکن نواب ممتاز محل نے جو بادشاہ کی سب بیگموں سے صورت و سیرت میں ممتاز تھیں، اپنے بیٹے مرزا جہانگیر کو منصب ولی عہدی پر فائز کرانا چاہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے بھی جہانگیر کو ظفر پر ترجیح دینے کی کوشش کی، لیکن دلی کے رزیڈینٹ بہادر نے جو مرزا ابوظفر کی بہت عزت کرتے تھے، مظلوم شاہزادے کو تسلی و تشفی دی اور ان کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔ظفر شعر و شاعری کی صحبتوں میں اپنا دل

بہلاتے اور غم ٹالتے تھے۔ رات کا کچھ حصہ عبادت و ریاضت میں صرف کرتے۔ مجالس حال و قال میں شریک ہوتے اور جب 1821ء میں مرزا جہانگیر نے انتقال کیا تو مرزا ابوظفر کو اپنے حقوق کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا، لیکن کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ مرزا ابوظفر کو سامنے سوائے خارستان کے کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو پہلے بادشاہ دلّی کا بھرم قائم رکھنے کی کوشاں تھی اب حالات کی تبدیلی سے اس کے نام و نشان کی دشمن بن گئی۔ بادشاہ کے اختیارات سلب ہونے لگے۔ ان کی تحقیر کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ سنہ 1835ء میں کمپنی کا سکہ رائج ہوا اور بادشاہ کا نام خارج ہو گیا۔ مغل بادشاہی کا انجام ظفر کو صاف نظر آ رہا تھا۔ ان کے دیوان اوّل میں ایک مسدس ہے جو اسی زمانہ کی آشفتہ حالی کا مرقع ہے۔ تین برس بعد اکبر شاہ ثانی جو اخلاقاً بادشاہ ولی کے خطاب سے سرفراز تھے۔ 28 ستمبر سنہ 1837ء کو اس عالم فانی سے رحلت کر گئے۔

30 ستمبر 1837ء مطابق جمادی الثانی سنہ 1253ء کو مرزا ابوظفر بہادر شاہ ثانی جامع مسجد تشریف لائے اور امام مسجد میر احمد علی نے رسم تاج پوشی ادا کی۔ سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے ریزیڈنٹ نے مبارک باد پیش کی۔ راج میں ترقی اور تنخواہ میں اضافے ہوئے۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کو عقیدتاً مال و زر عنایت ہوا۔ غرضیکہ وہ تمام رواج جو پشت ہا پشت سے چلے آئے تھے عمل میں آئے۔ عید، بقرعید کے موقعوں پر شاہی سواری تزک و احتشام کے ساتھ نکلتی جو شان و شوکت بادشاہوں کے شایان شان ہوتی ہے اس کا انتظام کیا جاتا، جب بادشاہ سلامت نماز عید سے فارغ ہو کر شاہزادوں اور سرداروں کے ساتھ نکلتے تو لوگ جگہ جگہ تحفہ دعا اور ہدیہ مبارک پیش کرتے۔ آمد و رفت کے وقت سلامی کی توپیں داغی جاتیں، غریب غربا اراکین سلطنت شاہی داد و دہش سے مالا مال ہوتے۔ امام مسجد کو خلعت فاخرہ مرحمت ہوتی۔ عاشورہ کو شاہی سواری درگاہ کی زیارت کے لیے جاتی۔ متولی متعلقین درگاہ کو حسب رُتبہ خلعت و رقوم تقسیم کیے جاتے، سادات عالی درجات کو پہننے کے کپڑے اور زر نقد فقراء و مساکین کو نیاز کا کھانا تقسیم کیا جاتا۔

بہادر شاہ ظفر کو بھی شاہان مغلیہ کی طرح تعمیرات کا شوق تھا۔ بہ سبب عسرت کے یہ شوق اس پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا جو ان کی خواہش تھی۔ تخریبی دور میں تعمیرات کہاں۔ جب ایوان سلطنت کی لرزاں بنیادیں نہ مستحکم ہو سکیں تو ضعیف بہادر شاہ پائیدار عمارتیں، سر بہ فلک قلعے کیسے بنواتا۔ بہ این ہمہ چند تعمیرات ان کی یادگار ہیں۔ قلعہ معلیٰ میں ہیرا محل کے پاس نہر بہشت کے کنارے ایک بارہ دری سنگ مرمر کی بنوائی اور حمام شاہی کے عقب میں ایک کنواں تیار کرایا جس پر تاریخ کندہ ہے۔ ایک جھرنا سنگ سرخ کا مہتاب باغ میں اضافہ کیا۔ درگاہ قدم شریف کے حوض میں سنگ سرخ کا جل محل (یا ظفر محل) بنوایا۔ حضرت قطب الدین کے مزار کے سامنے ایک خوبصورت اور عالی شان دروازہ تعمیر ہوا۔ مزار کے متصل ایک عالی شان محل تیار کرایا جس کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔ بوسیدہ عمارتوں کی اکثر و بیشتر مرمت کرائی اور مناسب اضافہ کیا۔

ایک طرف دست و تدبیر عمارات نو کی بنیاد رکھتا تھا، دوسری طرف دست تقدیر ایوان مغلیہ کی جڑیں کاٹ رہا تھا۔ باد مخالف کے تند و تیز جھونکے بابر کے لگائے ہوئے درخت کو منہدم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہادر شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی انگریزوں کو ان وعدوں کی طرف توجہ دلائی جو راجہ رام موہن رائے سے لندن میں کیے گئے تھے اور اپنے وظیفہ میں اضافے کی خواہش ظاہر کی۔ گورنر جنرل نے جواب دیا کہ اضافہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ بادشاہ ان تمام دعوؤں سے جو برٹش حکومت پر رکھتے ہوں دست بردار نہ ہو جائیں۔ بہادر شاہ اس پر راضی نہ ہوئے اور یہ قضیہ اختتام کو نہ پہنچا۔ جب انگریزوں کا تسلط تقریباً تمام ہندوستان پر ہو گیا اور بہادر شاہ کو قطب صاحب میں عمارات بنوانے اور وہاں زیادہ تر وقت صرف کرنے کی رغبت دلائی جانے لگی اور یہ طے کر لیا گیا کہ بہادر شاہ کے بعد ان کے جانشین سے قلعہ خالی کرا لیا جائے تو نظر شناس بادشاہ نے مسٹر ٹامن کو اپنا سفیر بنا کے لندن روانہ کیا اور اپیل کی۔ اگرچہ سفیر کی سعی سے وظیفہ میں پچیس ہزار کا اضافہ ہوا لیکن یہ شرط لگا دی گئی کہ بیرون قلعہ پرگنے اور دیہات جو ہنوز تولیت شاہی میں تھے ریزیڈنٹ کے سپرد کر دیے جائیں۔ احسن الاخبار بمبئی مورخہ 23 مئی سنہ 1846ء کے پرچے میں تحریر ہے کہ دلی کے بڑے صاحب کا حکم ہے کہ ہندوستانی امراء کو اطلاع دی جائے کہ وہ جب ہاتھی پر سوار ہو کر بازار میں نکلیں اور سامنے سے کسی انگریز کی سواری آتی ہو، تو پہلے اپنے ہاتھیوں کو بالکل کنارے کر لیا کریں، تاکہ آنے جانے میں مزاحمت نہ ہو۔ بیرونِ شہر چند باغات کے تنازعہ میں عدالت نے بادشاہ کے خلاف فیصلہ صادر کیا اور طے ہو گیا کہ قلعے کے باہر بادشاہ کو کسی قسم کا استحقاق نہیں ہے۔ غرض کہ دلی کے باشندے بخوبی سمجھ گئے کہ دار السلطنت پر بادشاہ کی ملکیت باقی نہیں اور سرکار کمپنی نے ان کے تمام اختیارات سلب کر لیے ہیں۔ اس زمانہ میں بادشاہ کے دل پر جو رنج و غم کا ہجوم تھا وہ ان کے اشعار سے جگہ جگہ ظاہر ہے۔

ظفر شعر و سخن سے راز دل کیونکر نہ ظاہر ہو
کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

باوجود زوال و انحطاط کے بادشاہ مکارم اخلاق سے متصف تھے۔ عجز و انکسار، کسر نفسی، عفو و حلم، ترنم اور حسن اخلاق سے ان کا سینہ لبریز تھا۔ کوئی کلمہ تمکنت و سطوت کا زبان پر نہ لاتے۔ نخوت و رعونت جو بادشاہوں کا خاص وطیرہ ہے ان کو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ ہر بندہ خدا سے خلق سے ملتے، زہد و صلاح طہارت و تقویٰ کی طرف مائل تھے۔ ایام ولی عہدی ہی سے بوجہ اپنی دینداری، پرہیزگاری، رحم دلی اور فیاضی کے ہر دلعزیز تھے۔ غریبوں سے اُنس تھا۔ داد و دہش، استطاعت سے زیادہ ہی کرتے، علماء و فضلاء کی صحبت سے خاصی دلچسپی تھی اور صاحبانِ کمال کی خدمت میں کوئی فروگزاشت نہ ہوتی تھی۔ دربار ذوق و غالب ایسے بلند پایہ شعراء سے مزین تھا۔ فقر و درویشی کی طرف ایام ولی عہدی سے طبیعت مائل تھی، لیکن

حوادث گوناگوں نے یہ نشہ بہت تیز کر دیا تھا۔ تخت سلطنت پر تصوف کے اسرار و نکات یہاں فرماتے اور لوگوں کو ہدایت و تلقین کرتے۔ پیری و مریدی کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا۔ جو شخص مرید ہوتا اس کو شجرہ عنایت ہوتا اور مسلمہ وحدت الوجود کی تعلیم دیتے۔ ایک سرخ رنگ کا رومال بطور تبرک عطا فرماتے۔ بیشتر مریدوں کو پانچ روپیہ ماہوار خزانہ عامرہ سے بطور مدد معاش ملتا تھا۔ گلستاں کی شرح تصوف کے نقطہ نگاہ سے خود لکھی اشغال و اذکار میں ایک کتاب ''سراج المعرفت''، مفتی میرلال سے لکھوائی۔

یہ عجیب و غریب بات ہے کہ قلعہ معلیٰ کی شان و شوکت، مائل بہ زوال تھی اور اردوئے معلیٰ مائل بہ عروج، سیاسی انحطاط کے اسی دور میں میر و غالب، و ذوق جیسے صاحبانِ کمال گزرے جنہوں نے زبان اردو کو استقامت اور بلندی بخشی۔ یہ حضرات بہادر شاہ ظفر کے ہم عصر تھے۔ اگر چہ بہادر شاہ از روئے شعر و سخن ان کے ہم پلہ نہیں۔ تاہم اردو شاعری میں ان کو نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔ اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری سے ان کو لگاؤ تھا۔ چنانچہ سب سے بیشتر شاہ نصیر کا تلمذ اختیار کیا۔ دیوان اول انہیں کا اصلاح کردہ ہے۔ وہی زباں ہے، محاورات اور وہی سنگلاخ زمینیں ہیں۔ شاہ نصیر کے دکن حیدر آباد چلے جانے کے بعد ذوق کے شاگرد ہوئے اور ذوق کے بعد غالب سے بھی اصلاح لیتے رہے۔ چار دیوان ظفر کی یادگار ہیں۔ پانچواں غدر میں تلف ہو گیا۔ رواج کے مطابق سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی اور ان کو پانی کر دیا۔ بقول آزاد جن سنگلاخ زمینوں میں قلم چلنا مشکل ہے، ان کا نظام و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔

گو ہر فلک پہ اختر وارادت، عشق کی واردات عام فہم اور سلیس زبان میں جرات کے رنگ میں نظم کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

سنا میں نے کٹی ہے ان کی ساری رات آنکھوں میں
کسی نے میرا افسانہ سنایا کچھ نہ کچھ ہوگا

زباں سادہ ہے، محاورے کے استعمال کا شوق ہے، کلام میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔ فارسی ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں۔ کلیات میں کمزوریاں ہیں اور کام اسقام سے مبرا نہیں، لیکن محاسن کا پلہ معائب سے اس قدر بھاری ہے کہ اس کی طرف خیال بھی نہیں جاتا۔ ان کی شاعری کا جوہر وہ اشعار ہیں جن میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ ایک ایک لفظ سے حسرت و یاس ٹپکتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی قسمت کی بد نصیبی، حوادث زمانہ کی ایسی عبرت ناک تصویر کھینچتی ہے کہ دل ٹکڑے ہوتا ہے۔ دیگر شعراء آپ بیتی کہتے ہیں اسی بنا پر ان کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے اور واقعاتِ زمانہ کی عکاسی کرتی ہے۔ میر کے نشتروں سے ان کے نشتر کم تیز نہیں ہیں۔ زمانہ کے ہاتھوں کچھ ایسے غم سہے کہ آخر کو ضبط نہ ہو سکا۔

روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

بادشاہ تھے، لیکن محض نام کے سب کچھ حاصل تھا مگر کچھ بھی نہیں۔

ستم ہے میں ہوں عین وصل میں ناکام جوں ساحل
کہ لب ہیں خشک میرے اور ہے آغوش میں دریا

سیہ بختی میں دوست بھی بہادر شاہ سے منحرف ہو کے درپے آزار ہوئے۔

اے ظفر دوست ہیں آغاز ملاقات میں سب
دوست پر وہ ہے کہ جو شخص ہوا انجام کو دوست

غدر کے زمانہ میں اس بوڑھے بادشاہ پر جو مظالم ہوئے، تاریخ ان کی شاہد ہے مال و دولت لٹا، بادشاہت ہاتھ سے نکل گئی، بابر کے خون سے سینچی ہوئی اکبر کی ہنرمندیوں سے مزین، جہانگیر کے عدل و انصاف اور شاہ جہاں کی شان و شوکت سے مرصع سلطنت کا یہ انجام خدا کی پناہ پھر دل کو قرار کیسے آتا۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

خاندان شاہی کے بیشتر افراد موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ شاہزادوں کو گولی مار دی گئی، ہزارہا باشندگان تختہ دار پر چڑھا دیے گئے۔ غریب بادشاہ زینت محل کی حویلی میں قید تھا اور اس ظلم و ستم کی خبریں روز سنا کرتا۔

مشتاق تھے جس کے خبر آئی کہ ہوا وہ
جس دوست کو پوچھا یہ سنا قتل ہوا وہ

خاندان تیموریہ کی یادگار پر بغاوت کا الزام عائد کر کے فوجی عدالت کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ نتیجہ معلوم تھا، عدالت کا فیصلہ طے شدہ تھا، جلا وطنی کا حکم صادر ہوا اور بادشاہ شہزادہ جوان بخت زینت محل ایک رفیق کے ساتھ دلی سے روانہ ہوا۔ سلطنت مغلیہ کا یہ فرمانبردار گیروا لباس زیب تن کیے، گوروں کے حلقے میں جا رہا تھا بادشاہ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

سنہ 1858ء کے اختتام سے پیشتر بابر کا وارث رنگون پہنچا اور وہیں نظر بند کر دیا گیا اور چھ سو روپیہ وظیفہ مقرر ہوا۔ غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اضافے کی درخواست کرے۔ چنانچہ زینت محل نے زیور بیچ بیچ کر زندگی کے دن پورے کیے۔ شاعری کا شوق رنگون میں بھی باقی رہا، حسب ذیل اشعار قید رنگون کی یادگار ہیں اور بہادر شاہ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکا میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

قید خانہ میں وہ موت کے انتظار میں گھڑیاں گزارتے، باہر شاذ و نادر جانے کا اتفاق ہوتا۔ بیشتر وقت نماز و دعا، تسبیح و استغفار میں صرف ہوتا۔ آخر کار ان کی دعا قبول ہوئی اور 7 نومبر 1862ء کو اس دنیائے فانی سے رحلت کی۔

اسی مکان کے احاطہ میں دفن ہوئے اور اسی کے پہلو میں زینت محل بھی بعد میں دفن ہوئیں۔

پس مرگ قبر پر اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے اُڑا دیا

CamScanner

سناٹا، سرخ آنکھیں، سترہواں سال

سدرہ مرزا/میاں چنوں

"میرے پاس جینے کو کیا بچا ہے شانزے! مجھ نہیں آتا کہ یہ۔۔۔یہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے؟ ایسے موڑ پہ کھڑی ہوں کہ ایک دھوکہ دینے والے شخص کو سب دیوتا بنا کر بیٹھ گئے اور مجھے۔۔۔مجھے گناہگار۔۔۔"

پچھلے آدھے گھنٹے سے انیل ٹیبل پہ کہنیوں کے بل ٹھوڑی ٹکائے روئے جا رہی تھی۔شانزے خود لاجواب تھی کہ آخر اسے کونسی تسلی دے کہ وہ سنبھل سکے۔کہانی وہی پرانی تھی محبت کے نام پہ دھوکہ۔۔۔تو پھر۔۔۔نیا کیا تھا۔۔۔جو اسے صبر آ کے نہ دے رہا تھا۔

"محبت کرنے والے ہمیشہ تکلیف کیوں دیتے ہیں؟"

انیل نے رات کے ایک بج کر تیس منٹ پر سٹیٹس اپ لوڈ کیا۔

"آپ محبت کرتی ہی کیوں ہے؟ کہ تکلیف ہو

"Someone commented.

ایک بج کر پینتیس منٹ پر انیل نے وہ Comment دیکھا۔سناٹا، عمر کا سترھواں سال اور سرخ ہوتی آنکھیں انیل کو دھیرے دھیرے Someone کے انباکس کی پیراڈائیز میں لے گئے۔

"آپ اتنے فری کیوں ہو رہے ہیں؟"

آپ تکلیف میں ہیں، تو بھائی چارے کی نسبت سے آپ کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہ رہا ہوں "دوسری طرف سے جواب آیا۔

"اوہ۔۔۔بھائی چارہ۔۔۔" طنز کیا گیا۔

"نہیں پسند تو جو بھی کہہ لیں "سوال جواب کا سلسلہ جاری رہا۔

"نہیں سوری"

You there?

Please dont disturb me. I am already worried.

"کیوں پریشان ہیں؟"

"میرا پرسنل میٹر ہے"

"چلیں جب دل کرے بوجھ ہلکا کرنے کو شانہ دستیاب ہے"

وائی فائی کا کنکشن وہ بہتے آنسوؤں میں بے دلی سے بند کرتی وہ آئی فون بند کرتی تکیے میں سر دیئے شاہ رام کے دیئے ہوئے درد کے نشتر سہلانے لگی۔

"تم رات ایک بجے تک جاگتی رہتی ہو۔۔۔کل رات میں لاؤنج میں آئی تو تمہارے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی"

ممی نے ناشتے کی میز پر استفسار کیا۔آپ ہر وقت میری ہی جاسوسی کرتی رہتی ہیں۔"

وہ چڑ گئی۔موڈ پہلے ہی برہم تھا۔

"ارے تم اسکا موڈ تو پہلے دیکھ لیا کرو"

بابا نے اسے اٹھ کر جاتے دیکھ کر عائزہ کو ڈانٹا۔جو اپنی فرض شناسی کے عوض ہمیشہ بری بن جاتی تھیں۔

"اگر میں بھی نہ سمجھاؤں اچھے برے سے تو پھر کون سمجھائے گا۔اور آپ آسانی سے مجھے سوتیلی ماں کہہ کر معاملہ ختم کر دیتے ہیں "وہ ایک اصول پرست عورت تھیں انہوں نے شکوہ کیا۔

"لیکن وہ اب سمجھدار ہے، اور اپنا بھلا برا خوب جانتی ہے بالغ ہے باشعور ہے۔اس طرح جاسوسی مت کیا کرو۔۔۔ہوسکتا ہے پڑھتی پڑھتی سوگ ءہو اور لائٹ آف کرنا یاد نہیں رہا"

بابا نے بیٹی کی محبت میں وضاحت دی تھی۔اور اکثر یہ اعتماد اور محبت ہی رسوائی کا سبب ہوا کرتا ہے۔جو ریاض صاحب کو بھی بہت تھا۔عائزہ نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

"اس نے میرے ساتھ تین ماہ بہت اچھے گزارے۔ہم 7/24 رابطے میں رہتے تھے"

انیل کی سترہ سالہ عمر سناٹا، سرخ آنکھیں اور Someone دھیرے دھیرے پاس آنے لگے تھے۔وہ جدید محبت کی کرامات 7/24 کو بڑے فخر سے بیان کرنے لگی تھی۔گارا ابھی کچا تھا۔اور قدم جم نہ پا رہے تھے زندگی میں، میسر ہونے کا عذاب اس پہ بھی طاری تھا۔سگنل بھی میسر تھے اور Someone بھی۔

راتیں سناٹے کے باوجود سیر حاصل ہونے لگیں۔کسی سنگدل کا دیا سوز Someone نے بانٹ لیا تھا

"ہم نے ہر چیز شیئر کر لی تھی"

"ہر چیز؟"

"ہاں۔۔۔"

"اچھا بتاؤ، وہ کیسا دکھتا تھا؟"

"وہ بہت حسین تھا۔۔۔"

"کتنا؟؟ تمہیں کیسے پتہ؟"

"میں نے اسے دیکھا تھا وہ روز یونیورسٹی جانے سے پہلے مجھے Snap کرتا تھا"

"اوہ۔۔۔پکچرز تو ایڈیٹ بھی ہو جاتی ہیں۔فلٹر بھی لگ جاتے ہیں۔۔۔پھر حسین کیسے ہو گیا۔۔۔۔؟"

"ارے۔۔۔ہم ویڈیو کال پہ بھی دیکھ لیتے تھے ایک دوسرے کو"

"اوہ اچھا۔۔۔۔۔"

"ہاں نا۔۔۔بہت یاد آتا ہے"

"ایک بات بتاؤ"

"بولو۔۔۔۔۔۔"

"کیا تم اسکے ساتھ ڈیٹ پر بھی جاتی تھی؟"

"امممم۔۔۔۔۔۔۔"

"بتاؤ بھی۔۔۔۔۔۔"

"ہاں نا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"بری بات"

CamScanner

"جس سے محبت ہو اسکی کوئی بات نہیں ٹالی جاتی "

انیل نے غمگین ہوتے ہوئے Text کیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔اچھا کیا میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں"

"کیوں؟تم مجھے دیکھ کر کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں بس یونہی۔۔۔۔۔"

انیل کچھ دیر سوچتی رہی پھر جواب دیئے بنا سو گئی۔

تین دن بے قرار گزر گئے تھے۔محبت سے زیادہ ظالم عادت ہوا کرتی ہے۔اسے اس Someone کی عادت ہو چکی تھی۔

جس کی غیر موجودگی اب الجھن کا شکار کئے تھی۔

"اب تم کتنی خوش رہتی ہو نا؟؟"

شانزے نے انیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔اب میری لائف کا وہ ٹرائینگ فیز گزر گیا شکر ہے"

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"محبت بھلانے کے لئے چند مہینے کافی ہیں۔۔۔۔ہے نا؟"

شانزے نے اسے بغور دیکھ کر پوچھا۔

Come on yar ۔۔۔۔محبت نہیں تھا وہ میری۔۔۔۔۔یونہی بونگی کہہ لو۔۔۔اب ہنسی آتی ہے کہ وہ کتنا خودغرض تھا اور کتنا ترساتا تھا مجھے"

"اچھا !جو لوگ شدت سے رلاتے ہیں کچھ عرصے بعد شدت سے ہنساتے بھی ہیں"

شانزے نے اپنے تئیں انکشاف کیا۔

اچھا تمہیں بتاؤں مائز بہت اچھا ہے۔۔۔۔"

"تمہیں تو وہ بھی بہت اچھا لگتا تھا۔"

شانزے نے بے دلی سے کہا۔

"نہیں یہ واقع ہی اچھا ہے۔"

اس نے خیالوں میں مگن قوس قزح سے رنگ چہرے پر لئے کہا۔

"تمہیں اس نے بے وقوف بنایا تھا بس۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ایسا نہیں ہے وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔۔۔۔۔"

"پھر چھوڑا کیوں؟"

"میری غلطی تھی میں نے بہت بدتمیزی کر دی تھی۔۔"

"اچھا۔۔۔۔چلو چھوڑو۔۔۔"

"میں نے تم سے ایک بات کرنی ہے"

"کیا؟کرو۔"

"کیا میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں؟"

"مجھے۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔اس میں کیا حرج ہے تم کون سا لڑکی ہو"

"نہیں لڑکی تو نہیں۔۔۔مگر تمہیں تصویر بھیجنے کا کہا تو مانی نہیں تھی۔اب پھر مجھ سے کیوں؟؟"

چند لمحے توقف کے بعد انیل نے بنا کچھ کہے تصویر بھیج دی تھی۔

"اوہ۔۔۔۔تم تو بہت خوبصورت ہو"

"اب بھیجو۔۔۔۔"

"کیا؟"

"اپنی تصویر"

انیل قریباً ایک گھنٹا تصویر کا انتظار کرتی رہی تھی۔مگر دوسری طرف ہری بتی بند تھی۔وہ آف لائن تھا۔

پھر اسے نیند آ گئی۔

"شانزے یار مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میری تصویر لے کر وہ یوں غائب کیوں ہو گیا؟"

پورا ہفتہ گزر گیا تھا مگر انیل کو تصویر نہ مل سکی تھی۔

"تو تم نے کیوں بھیجی تصویر؟"

"مجھے یقین ہو چکا تھا اس پر۔۔۔اور اس لیئے بھیجی کہ وہ بھی بھیج دے۔۔۔مگر وہ تو خود ہی غائب ہے۔"

"اب کیا کرے گا وہ۔۔۔کیا وہ تصویر ہی مانگنا چاہ رہا تھا۔۔۔"

شانزے نے خدشہ ظاہر کیا۔

"نہیں اس نے کبھی ایسا کچھ اظہار نہیں کیا۔۔۔وہ تو میں نے اسے کہا کہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔"

"چلو چھوڑو۔۔۔۔۔کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔۔۔پتہ چل جائے گا اللہ سب بہتر کریگا"

"ہاں۔۔۔۔شاید۔۔۔۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔۔

"اوہ۔۔۔تم بھی بہت ہینڈسم ہو۔۔۔۔"

"تھینکس"

"میں بہت پریشان تھی کہ میری تصویر لے کر تم کہاں غائب ہو گئے"

"ارے تمہاری تصویر کا میں کیا کروں گا۔حیرت ہے۔۔۔۔"

"بس یونہی۔۔۔پریشانی سی ہو رہی تھی،کہاں تھے ویسے تم؟"

"ارے بتایا تو ہے کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔بس اب کچھ بہتر ہوں۔۔۔"

"اچھا اور تصویریں ہیں کیا؟"

"میں ابھی ہاسپٹل میں ہوں۔۔اور تم۔۔"

"چلو یہیں سے لائیو بھیج دو۔۔۔۔"

"فیملی ممبرز پاس ہیں۔۔۔۔کچھ عقل کرو۔۔۔اوکے پھر بات ہو گی"

انیل کے دل میں کچھ وسوسے آنے لگے تھے۔

"ہم کہیں ملیں؟ویسے بھی یونیورسٹی سے آف ہے میں فری ہوں۔۔۔۔بور ہوتی رہتی ہوں۔۔۔کیا خیال ہے میرے آئیڈیا کے بارے میں"

انیل نے ٹیکسٹ چھوڑا۔

"دیکھو ہمارا ملنا کوئی اچھی بات نہیں"

"اچھا؟۔۔۔تبلیغ کب سے شروع کر دی تم نے؟میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں بس۔اور۔کیا؟"

"اگر تم کسی کو بھی دیکھنا چاہو تو اس سے فوراً ملنے نکل پڑو گی کیا؟"

"تم اگر مل نہیں سکتے تو یہ خطبہ بھی بند کرو۔۔۔۔مجھے کیا کرنا کیا نہیں بہتر پتہ ہے۔۔۔۔"

"ناراض مت ہو میں یونہی کہہ رہا تھا"

اب انیل کے دل میں آنے والا وسوسہ سر اُٹھانے لگا تھا،کہ آخر وہ اسکی تصویر لے کر غائب کیوں ہو گیا تھا۔،اور پھر اگر وہ اس کے ساتھ مخلص تھا تو ملنے

سے انکار کیوں کر رہا تھا۔ جبکہ ہمیشہ اس نے اپنے اس کے ساتھ اخلاص پہ ہی زور دیا تھا۔ آخر یہ سب وسوسے کیوں آ رہے تھے اسے۔

جبکہ ابھی تک اسے اپنی تصویر کے حوالے سے جوان سیکیورٹی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی۔

"تم بلاوجہ اوورتھنک کر رہی ہو۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔۔۔ ہر مرد دھوکے باز یا مطلب پرست نہیں ہوتا۔۔۔ مجھے لگتا ہے وہ تمہارے لیے اللہ کی طرف سے نعمت بن کر آیا ہے۔۔۔"

شانزے نے گھاس کو اکھاڑتے ہوئے جواب دیا۔ وہ گارڈن میں ٹینس کھیلتی ہوئیں گھاس پہ آ بیٹھی تھیں۔

"ہاں نعمت یا پھر زحمت؟؟"

انیل افسردہ تھی۔

"ارے نہیں زیادہ مت سوچو۔۔۔ چل کرو"

"یار میں نے سوچا تھا اب کسی سے فرینڈ شپ نہیں کرنی۔۔۔ بعد میں بہت مشکل ہو جاتی یار۔۔۔ مجھے تو رات ایک بجے تک چیٹ کی ایسی لت پڑی تھی کہ تم سوچ نہیں سکتی۔۔۔ وہ تو شکر ہے کسی اور نے تنہائی بانٹ لی۔۔۔"

وہ ہولے سے مسکرائی۔۔۔

"بس یہی وجہ ہے ہم جیسی زی (Z) جنریشن کے ڈپریشن کی یار۔۔۔ فوراً سے پہلے دستیاب Replacement۔۔۔ ہمارے پاس ہر دکھ، ہر مسئلے، ہر کرائسز کی Replacement موجود ہے۔ AI کی شکل میں اور جلدی جلدی ہر چیز متاثر کر کے جلدی جلدی ہمیں چھوڑ جاتی ہے۔۔۔"

شانزے نے افسردگی سے کہا۔

"کیسے لوگ تھے وہ جو ایک ہی فرینڈ کے لئے دل کا روگ پال لیتے ہوں گے۔ اف۔۔۔ کتنا بورنگ"

انیل نے گھاس پر لیٹتے ہوئے آئی فون پرومیکس پاکٹ سے نکالا۔ "پہلے وقتوں میں لوگ Breakup ہونے پر اللہ والے ہو جاتے تھے۔۔۔ یونو"

شانزے نے فن کے موڈ میں اسکے قریب لیٹ کر کہا۔

"اچھا سنو۔۔۔ مجھے وہ بہت اچھا لگنے لگا ہے۔۔۔ یار! میں اسکے ٹیکسٹ کا نوٹیفیکیشن دیکھ کر ہی پاگل ہو جاتی ہوں۔۔۔ ہی رئیلی کیئرز می یار"

(He really cares me yaar!)

"اچھا۔۔۔ تو پھر Proceed کرو نا Relation کو۔۔۔ Stuck ہو گئی ہو تم تو۔۔۔" شانزے نے بھی اپنا اینڈرائڈ نکالا اور پھر دونوں اپنے اپنے Someone میں کھو گئیں۔

"اگر تم سنجیدہ ہو میرے لئے تو پھر۔۔۔ پھر۔۔"

"پھر کیا بھئی۔۔۔؟"

"ہم کل گلوریا جینز میں مل رہے ہیں۔ میں ریزرویشن میسج فارورڈ کر دوں گی۔۔۔ ڈھونڈنے میں پرابلم نہ ہو۔۔۔ اور مجھے تو تم نے دیکھ ہی رکھا ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو آسانی سے پہچان لینگے۔۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔۔۔؟ کیا اتنا پرائیویٹ ملوگی مجھ سے؟۔۔۔ تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟"

"ڈر۔۔۔؟ تم شیطان مت بنو اب "وہ مسکرائی۔

"اکیلے مرد اور شیطان میں بہت کم فرق ہوتا ہے انیل۔۔۔ اکیلا مرد شیطان بن جاتا ہے۔

"اکیلا مرد؟۔۔۔ I trust you"

"ٹرسٹ تو تم اس پہ بھی کرتی تھی"

"لیکن۔۔۔ تمہارے ساتھ میں بہت سنجیدہ ہوں"

"سنجیدہ۔۔۔ کتنی سنجیدہ؟"

"کیا باتوں میں الجھا رہے ہو۔۔۔ میں Proceed کرنا چاہتی ہوں یار۔۔۔ میں اب تمہارے لیے ٹیکسٹ کی آسرے پہ مزید وقت نہیں گزار سکتی۔۔۔ محبت میں انسان مزید بھی چاہتا ہے۔۔۔ دیکھنا۔۔۔ ملنا۔۔۔ Feel کرنا۔۔۔ یونو"

"تو کیا تمہیں واقعی ڈر نہیں لگے گا؟"

"نہیں بالکل نہیں"

گرین سگنل کے میسج پہ سناٹا، سرخ آنکھوں اور سترہ سالہ عمر میں اب سنسنی کا اضافہ ہو چکا تھا۔۔۔

"آ رہے ہو نا؟۔۔۔" خاموشی میں انیل نے پتھر پھینکا۔

"ہاں۔۔۔ تمہیں مزید ڈر نہ لگے۔۔۔ تمام Fears سے نکالنے کے لیئے۔۔۔ میں کل مل رہا ہوں۔۔۔"

"اوہ رئیلی۔۔۔ See you... for proceedings"

کافی سارے ایموجیز میں آخری ٹیکسٹ کو انیل نے بار بار پڑھا۔۔۔

شانزے! یار وہ ابھی تک نہیں آیا۔ ایک گھنٹہ ہو گیا مجھے ویٹ کرتے۔۔۔"

انیل نے ارد گرد دیکھتے ہوئے پریشانی سے شانزے کو کال کی۔

سیاہ ٹاپ اور ٹائٹس ٹخنوں سے اوپر کیپری گلوریا جینز کے نیم خوابیدہ ماحول میں الجھن کا شکار بیٹھی تھی۔ دور تین چار ٹیبلز پر لوگ کافی کو انجوائے کر رہے تھے۔

تنہا بیٹھی وہ ہر 15 منٹ بعد شانزے کو کال ملا لیتی۔ Someone مسلسل آف لائن تھا۔

الجھن سے اس نے سامنے ٹیبل پر ایک ادھیڑ عمر سانولے رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس مرد کو خود کو گھورتے پایا۔ اب وہ مزید الجھن میں تھی۔ رات بھی بہت ہو رہی تھی۔

چند لمحوں بعد موبائل پر بجی۔۔۔ یہ بابا کی کال تھی اس نے بے دلی سے کال اٹھائی۔

"کدھر ہو انیل؟"

"بابا میں شانزے کے گھر پہ ہوں۔۔۔ وہ کمبائن سٹڈی کے لیئے میں آج ادھر ہی رکوں گی

"۔۔۔۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔۔۔"

بابا نے کال بند کر دی تھی۔ پہلے کی طرح وہ چونچلے نہیں کر رہے تھے۔ مگر انیل کے لیئے فلحال یہ غیر اہم مسئلہ تھا۔

کچھ دیر مزید گزری تھی کہ سامنے ٹیبل پر بیٹھے شخص کو اس نے اپنی طرف آتے دیکھا۔

چند لمحے وہ اسے سامنے کھڑا دیکھتی رہی پھر بالآخر ہمت کر کے وہ بولی۔

" کون ہیں آپ؟"

"میں۔۔۔۔؟ اس شخص نے ذرا مسکرا کر دوبارہ اسے ہی سوال کیا۔

" کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟

ہٹیں یہاں سے۔

دل میں لاحول کا ورد کرتی انیل نے اردگرد مدد طلب نظروں سے دیکھنا چاہا۔

"شور مت ڈالنا لڑکی۔۔۔۔۔کیوں کہ تھوڑی دیر میں یہ خود ہی پڑ جائے گا"

اس شخص نے نہایت تحمل سے اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''آخر ہیں کون آپ؟۔۔۔کیا چاہتے ہیں''

سہمی آواز میں اس نے اسے کرسی کھینچ کر بیٹھتے دیکھا۔

" تمہارا محسن۔۔"

What the hell

وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولی۔

"انیل ہو نا؟؟"

اس شخص نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں انیل۔۔۔۔ آپ کو کیسے پتہ؟"

اس اجنبی کی مونچھوں کے نیچے دبے ہونٹوں سے اپنا نام سن کر انیل پریشان کی ساتھ حیرت میں مبتلا تھی۔

"بوائے فرینڈ کا انتظار کر رہی تھی نا؟ "

اس شخص نے پھر کہا۔

وہ لاجواب تھی۔

"شکر کرو نہیں آیا وہ۔۔۔۔۔۔"

" کک۔۔۔۔۔کیا مطلب۔۔۔۔؟"

انیل کو دیواریں خود پہ گرتی معلوم ہو رہی تھیں۔

" کب تک مزید بوائے فرینڈز کو دعوت دیتی رہو گی۔ رات کی تاریکی سے متاثر ہو کر سترہ سالہ عمر میں خود کو داغدار کیوں کرنے پہ تلی ہو؟"

اس شخص کے لہجے میں ابھی بھی تحمل تھا۔

پھٹی آنکھوں اور سرخ لپ سٹک کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہونٹوں سے وہ اس شخص کو دیکھ اور سن رہی تھی۔۔ آخر وہ اس کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتا تھا۔

"آخر آپ۔۔۔۔۔کون ہیں اور یہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔"

لرزتی زباں سے کہتے ہوئے اس نے مینو کے پاس پڑا آئی فون اٹھایا۔

اسکے حلق میں چبھتے کانٹے ذرا کی ذرا نرم ہوئے گرین بتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے تمام ٹیکسٹ Someone کو ڈلیور ہو چکے تھے۔ وہ آن لائن بھی تھا۔

بغیر وقت ضائع کیے اسنے کال ملادی تھی۔

وہ چیخ چیخ کر اسکو بتانے کے لیئے کہ کیا ہوا ہے الفاظ کا ذخیرہ جمع کرنے لگی تھی۔ سب کچھ اتنی جلدی سے ہو رہا تھا۔ کہ اسنے اچانک دیکھا کہ سامنے بیٹھے شخص کے موبائل پر کال بیل بجنے لگی۔

اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے موبائل اٹھایا اور انیل کو دیکھنے لگا۔ انیل سمجھ نہ پائی کہ ہو کیا رہا تھا۔

" کال بند کر کے لائیو چیٹ کر لو۔۔۔۔"

اس شخص نے طنز سے اسے دیکھا۔ فون انیل کے ہاتھوں سے گرا۔

اسی لمحے کیفے کا بیرونی Entrance کھلا اور ریاض صاحب غصے سے آگ بگولا تمام ٹیبل پر انیل کو تلاشتے اسکی طرف آئے تھے۔

انیل انہیں دیکھ کر خوف سے کھڑی ہوئی۔ اب Someone کے بجائے بابا نظر آ رہے تھے۔

"یہ۔۔۔۔۔یہ ہے شانزے کا گھر اور۔۔۔اور یہ ہے کمبائن سٹڈی۔۔۔۔۔؟ بتا۔۔۔؟"

غصے طنز اور دکھ کی ملی جلی کیفیت سے ریاض صاحب نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"بابا۔۔۔۔۔"

اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، نیم برہنہ ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

Someone کھڑے ہو کر ریاض صاحب سے مل رہا تھا۔

"شکریہ محترم۔۔۔آپ نے یہ سب کیا۔۔۔۔ورنہ۔۔۔۔۔ورنہ میں ہمیشہ لاعلم رہتا اور کسی بڑے نقصان کا شکار ہو جاتا شاید"

ریاض صاحب Someone کا شرمندہ نظروں سے شکریہ ادا کر رہے تھے۔

"میرا مقصد آپکو پریشان کرنا نہیں تھا ریاض صاحب!۔۔۔۔میں نے بھلائی کی نیت سے یہ سب کیا ہے۔۔۔۔مجھے لگتا تھا یہ میری باتوں سے سمجھ جائے گی۔

لیکن میرا خیال ہے یہ آپ کے چیک اینڈ بیلنس سے ہی سمجھ سکتی تھی۔ بزنس کریں۔۔۔میٹنگز کریں۔ اولاد کو ہر سہولت دیں۔۔۔لیکن۔۔۔۔لیکن یاد رکھیں۔ اگر جنریشن Z کے بعد کوئی جنریشن نہیں آگے۔۔۔۔۔کوشش کریں کہ تھوڑا وقت دے کر اسے ہی ریکور کر لیا جائے ریاض صاحب۔۔شکریہ۔۔۔ انیل کو گھر لے جا کر سمجھا لیجئے گا۔۔۔لوگ دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔چلتا ہوں۔۔۔۔خدا حافظ "

Someone ان سے مل کر جا چکا تھا۔

انیل کا بازو کھینچ کا ریاض صاحب اُسے ساتھ لئے جا رہے تھے۔

دونوں کے پاس پچھتاوا اور خوف تھا۔

⊙⊙⊙

اللہ کا دین

آسناتھ کنول/لاہور

درد کی شاخوں پر پھر سے
زخموں کے پھول مہکتے ہیں

کون ہے جو اِن کی خوشبو سے فیض یاب ہونا چاہے۔ درد کی شاخیں جو ہوا کی تیزی سے اُمڈ اُمڈ کر اُبھر اُبھر کر اُس کی خستہ کھڑکیوں سے ٹکراتی رہیں۔ مدتوں پرانے شیشے آپس میں کسی گھنٹی کی طرح بجتے اور اِک پُر اسرار سا شور اُس کی جھکی ہوئی چھت والے کمرے میں بھی جاتا جہاں وہ اکیلا ہی حالات کی سنگینی سے نبرد آزما تھا۔ بل ادا نہ کرنے کی وجہ سے بجلی کٹ چکی تھی۔ اب ایک ننھا سا موم بتی کا شعلہ اِس مہیب تاریکی کو سمیٹنے کی سعی ناکام میں مبتلا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے کسی بھی کواڑ سے ہوا کا ایک وحشی جھونکا ٹکراتا تو یہ ننھا سا کمزور شعلہ کانپ کر رہ جاتا۔ کمرے میں اور کوئی مناسب جگہ بھی نہیں تھی جہاں یہ شعلہ محفوظ رہ سکتا۔ وہ کسی آن میں دم توڑ سکتا تھا۔ اور اِس سے زیادہ خستہ حال اور بے جان وہ شخص تھا جو خود اپنی زندگی کا دِیا جلائے رکھنے میں بے طرح مصروف تھا۔ مگر درد کہ ہر آن بڑھتا تھا۔

کسی ناکردہ جرم کا سزاوار تھا کہ سزا ختم ہونے کو ہی نہیں آتی تھی۔ بن بلائی وحشتوں میں گھرا، سوچوں کے گرداب میں ڈوبتا اُبھرتا، ہاتھ پاؤں مارتا تھا۔ کوئی تو ہو جو اُسے زندگی کی راہ پر ڈال دے۔ زندگی لمحہ لمحہ درد میں غرق ہوتی جاتی تھی۔ باہر وحشی موسم اُس کے اکلوتے کمرے کے اِردگرد اپنے وحشی رقص میں مگن تھا۔ اُسے کب پروا تھی کہ ٹوٹے پھوٹے گھونسلے کا واحد مکین اپنی بیماری اور حالات کے بوجھ تلے دبا کراہتا تھا۔ کاش وہ زندگی سے بے نیاز ہو سکتا!! مگر نہیں۔ اُسے یہ وزنی گاڑی اپنے زخمی ہاتھوں سے کھینچنی تھی۔ ہر لمحہ تڑپ تڑپ کر گذرتا اور اُس کے بدن میں اِک چیخ بن کر اُتر جاتا۔

ایک گھور تاریکی نے چاروں جانب عفریت پھیلا رکھا تھا۔ وہ تاریکی کے اِس پنجہ استبداد سے نکلنا چاہتا تھا مگر نکل کر کہاں جاتا۔ باہر موسم کی وحشتیں عروج پر تھیں۔ اور اندر درد اور گھٹن جان لیوا تھی۔ یا میرے مولا سویرا کب ہوگا؟ کب روشنی کا مسافر میرے گھر میں اُترے گا اور مجھے تسلی دے گا۔ ہاتھوں کے درد سے ادھ موا ہوتا وہ اِک خستہ لحاف میں دبکا رہا۔ آنسو اُس کے پھٹے ہوئے دامن کا نوالہ بنتے رہے۔ کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا سوائے پانی کے جس کا ایک جگ وہ ہمسایوں کے گھر سے بھر کر لایا تھا۔ وقفوں وقفوں سے وہ اُسے پی کر اپنے سینے اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرتا۔ بادل زور سے گرجا۔ بجلی کی چمک اُس کے کمرے کے اندر تک اُتر آئی وہ سہم کر دیوار سے جا لگا۔ یا اللہ خیر، یا ربّ میری فریاد بھی سُن لے۔ اپنے بندے کے زخموں کا چارا کر۔ میں یہاں لاوارث مر بھی جاؤں تو کون مجھے سنبھالے گا۔ گھر والوں کے لیے مجھے زحمت نہ بننے دینا۔ اُن کی اُمید مجھ سے اور میری اُمید تجھ سے ہے۔ یا میرے مولا! میرے دل کی پُکار کو سُن لے۔ وہ بلکنے لگا۔ وہ جسے یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ خدا بھی ہوتا ہے۔ اب اُسی خدا سے مدد کی فریاد کر رہا تھا۔

غربت کی داستان دہرائی نہ جائے مولا!

روتے روتے نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ نیند تو سولی پہ بھی آ جاتی ہے۔ اچانک ہی آنکھ کُھلی تو سورج کی روشنی پوری آب و تاب سے اُس کے چھوٹے سے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اُسے گونا خوشی ہوئی۔ جیسے زخموں کی ٹیس کم لگ رہی تھی۔ وہ اُٹھا پانی پیا۔ اُسی کے چھینٹے منہ پر ڈالے۔ پیروں میں چپل گھسیڑے باہر کو لپکا۔ شاید کوئی مزدوری مل جائے۔ وہ فٹ پاتھ کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا دوکان کے تھڑے کے پاس جا بیٹھا۔ یہاں اور بھی لوگ اپنے ڈبے اور مزدوری کا سامان رکھے انتظار میں تھے کہ کوئی اُنہیں کام کے لیے لے جائے۔ پچھلے دو دن کی بھوک کی وجہ سے چکر بھی آ رہے تھے۔ دو دن پہلے اینٹیں اُٹھاتے ہاتھ بھی زخمی تھے۔ کوئی مزدوری پر لے جائے یا خدا آج تو مجھ کافر گنہگار کی بھی سُن لے۔ مجھے مزدوری مل جائے۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑا رہا تھا۔ سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا اچانک ہی ایک ویگن آ کر رُکی۔ آ جاؤ بھئی سارے کافی کام ہے۔ سب بھاگ بھاگ کر ویگن میں گھس گئے۔ کسی نے اُس کو گھسنے ہی نہ دیا۔ وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

ویگن بھر گئی تھی۔ سب نے حقارت سے اُسے دیکھا تو اپنے ہی اندر بار دیگر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ تمہیں کام نہیں چاہیے؟ اچانک ایک نسوانی آواز اُس کے قریب سے آئی۔ سیاہ کرولا میں اِک عورت اُس سے پوچھ رہی تھی۔ کسی بڑے گھر کی بیگم صاحبہ۔ وہ بھاگ کر اُس کے قریب پہنچا۔ سلام بیگم صاحبہ! کام چاہیے۔ بیگم صاحبہ نے اُس کی آنکھوں کی بے چارگی پڑھ لی

تھی۔ بظاہر جوان آدمی مگر حالات کا مارا ہوا خستہ حال۔ یقیناً یہ دل لگا کر کام کرے گا۔ وہ ایک کاروباری عورت تھی اور خوب سمجھتی تھی۔ چہرہ شناس تھی۔ ویگن میں بیٹھ جاؤ۔ جگہ نہیں رہی۔ وہ گڑگڑایا۔ چلو گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ اُس نے اگلا دروازہ کھول دیا۔ پہلے تو وہ جھجکا۔ وہ اتنا خستہ حال پھٹے ہوئے کپڑے اور اِس شاہانہ گاڑی میں۔ بیٹھو!! دوبارہ ذرا سختی سے کہا گیا تو وہ جلدی سے سمٹ کر سیٹ کے ایک طرف لگ گیا۔ بیگم صاحبہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں اور اُنہیں مڑ کر دیکھنا گناہ تھا۔ مخملی سیٹ پر بیٹھ کر ہی وہ خوف سے دُہرا ہوتا رہا۔ یا خدا یہ کیسی کایا پلٹ ہے۔ تو نے مجھ گنہگار کی سُن لی۔ وہ عاجزی سے اللہ کا شکر ادا کرتا رہا۔

گاڑی ایک بلڈنگ سائٹ کے پاس جا رُکی۔ دروازہ کھلا تو وہ جلدی سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ تابعداری سے نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ بیگم صاحبہ باہر نکلیں۔ وہ ادب سے اور دہرا ہو گیا۔ وہ سراپا حسن و جمال تھی جس کی گاڑی میں وہ بیٹھا تھا۔ کیا کچھ کر سکتے ہو؟ ج۔ ج۔ ج جو آپ کہیں بیگم صاحبہ۔ اپنے ہاتھ دکھاؤ۔ وہ وہ وہ جھجکنے لگا۔ کب ایسے لوگوں سے اُس نے بات کی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے ہاتھ آگے کیا۔ زخمی ہاتھ۔ اوہ مائی گاڈ!! تم تو زخمی ہو۔ وہ۔۔ وہ دو دن پہلے اینٹیں اُٹھاتے کچھ اینٹیں گری تھیں۔ اِس وجہ سے وہ گھبرایا سا داستان سُنانے لگا۔ تو ایسے تم کام کر سکتے ہو؟ جی جی بیگم صاحبہ۔۔۔ دو آنسو نجانے کہاں سے ٹپک پڑے۔ بیگم صاحبہ کا دل موم ہو گیا۔ شو! اُس نے ڈرائیور کو بُلایا۔ پہلے اِس کی مرہم پٹی کراؤ۔ دوائی لے دو اور اِسے کچھ کھلاؤ۔ ٹھیک ہو جائے گا تو کام پہ لگا دینا۔ جی بیگم صاحبہ۔ ہاں اور سب مزدوروں کی رہائش اور کھانے کا انتظام یہیں کرنا۔ سرور صاحب کو بتا دو۔ کوٹھی کے دو کمروں میں گدے اور کمبل ڈال دے۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے؟ وہ جانے سے پہلے پلٹ آئی۔ بہادر علی۔ ہوں۔۔ چلو آؤ بہادر علی۔ ڈرائیور اشفاق حسین اُسے لے کر زیرِ تعمیر کوٹھی کی طرف چل پڑا اور اُس کے ساتھ آنے والے سب مزدور اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

جو حقارت سے دیکھا کرتے تھے وہ اب حسد کا شکار ہو رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کی خصوصی توجہ اُس پر تھی۔ وہ سب جل بھن گئے جب اُسے اشفاق حسین کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا۔ اشفاق حسین نے ایک کلینک سے اُس کی مرہم پٹی کروائی۔ پھر ایک ڈھابہ ہوٹل پر لے گیا۔ جہاں تین دن بعد اُس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر وہ اُسے بازار لے گیا اور اُسے دو تین سلے ہوئے موٹے سوٹ بھی لے دیئے۔ یا میرے مولا! تو ایسے ایسے جلوے دکھاتا اور ہاتھ پکڑتا ہے کہ بندہ سوچتا رہ جاتا ہے۔ میری توبہ جو میں کبھی تجھ پر شک کروں۔ وہ دو دن میں ہی ٹھیک ہو گیا۔ اُسے کوٹھی کے اندر ہی کام مل گیا۔ کاریگر تو وہ تھا ہی، کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ دل لگا کر کام کر رہا تھا۔ اُس کے کام میں کافی نفاست تھی۔ مہینہ گذر گیا تھا۔ باقی مزدور بس کام کم کرتے اور اُس کے خلاف زیادہ سوچتے۔ بہادر علی کو کھانے، پینے، پہننے، سونے کو سب میسر تھا تو اُس کا مدقوق سا چہرہ بدلنے لگا۔

ایک مہینے بعد بیگم صاحبہ نے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ بیگم صاحبہ نے بطور خاص اُس کا کام دیکھا اور خوش ہو گئیں۔ اشفاق حسین یہ لڑکا اچھا کام کرتا ہے، اِسے مستقل رکھ لینا۔ جی بیگم صاحبہ۔ باقی مزدور تو انتقاماً سست روی کا شکار تھے۔ ایک دن فضل دین نے پوچھ ہی لیا۔ بہادر رے بڑا چمک رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کو پسند آ گیا ہے تو۔ کیا کہہ رہے ہو فضل دین خدا کا خوف کرو۔ مجھے اللہ نے ایک سہارا دیا ہے۔ اِس کے خلاف کچھ غلط سوچنا بھی مت۔ وہ یکدم اپنے رویے کے برعکس غصے میں آ گیا۔ وہ ہماری ان داتا ہیں۔ ہم سب اُن کی وجہ سے یہاں ہیں۔ بس دل لگا کر اپنا کام کرو۔ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں، پر تیری حرکتیں ٹھیک نہیں۔ کیا!!! وہ ڈر گیا۔ کیا کیا ہے میں نے!!! بہادر نے تیزی سے پوچھا۔ بیگم صاحبہ کے پیچھے کتے کی طرح دُم ہلاتا پھرتا ہے۔ تیرے خیالات ٹھیک نہیں۔ بہادر علی اِس الزام پر سر تا پا سُلگ اُٹھا۔ اپنی بکواس بند کرو، میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ فضل دین تم حد سے بڑھ گئے ہو۔ میں یہاں صرف مزدوری کرتا ہوں سمجھے۔

ہاں ہاں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ فضل دین زور زور سے بولنے لگا۔ اُس کا مقصد باقی مزدوروں کو بُلانا تھا جو بلاوجہ اُس پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ سب اِس منہ ماری میں حصہ ڈالنے لگے تلخ باتیں ہاتھا پائی تک جا پہنچیں تو سب اُس پر ٹوٹ پڑے۔ نجانے کون سا غصہ اور حسد نکالنے لگے۔ ساری کوٹھی میں بات پھیلی۔ سب لوگ بھاگے آئے۔ مینجر سرور، اشفاق حسین اور دیگر تب تک وہ بہادر علی پر اپنا غصہ اُتار چکے تھے۔ یہاں سے کوئی بھاگنے نہ پائے۔ مینجر نے اپنا پستول نکال لیا۔ قریبی تھانے میں فون کیا گیا۔ آن کی آن میں پولیس پہنچ گئی۔ بہادر علی مشکل سے سانس لے پا رہا تھا۔ سارا بدن خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کچھ

لوگ بھاگنے لگے تو پرانے مزدوروں نے گھیرا ڈال لیا۔ اُن آٹھ لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا جو اُسے مارنے میں شامل رہے۔ بہادر علی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ بیگم صاحبہ کو واقعے کی اطلاع ملی تو وہ بھاگی آئیں۔ بہادر علی کو دیکھا۔ ڈاکٹر اُس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اِس آدمی کو بچنا چاہیے۔ وہ تھانے پہنچی تو وہی سب لوگ تھے جنہیں وہ اُس تھڑے سے کام کے لیے لے کر آئی تھی۔

فضل دین تم سمجھدار آدمی لگتے تھے پھر ایسا کیا ہوا کہ تم نے بہادر علی کی جان لینے کی کوشش کی۔ وہ۔۔۔ وہ جی آپ کے بارے بُری باتیں کر رہا تھا۔ غلط بات ۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تھانیدار صاحب اِن سے سچ اُگلوائیں۔ کیونکہ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ حالات کا مارا ضرور ہے مگر بُرا آدمی نہیں۔ میں جانتی ہوں۔ اُس پر میری توجہ کی وجہ سے یہ سب حسد کا شکار ہوئے۔ جب تک بہادر علی ٹھیک نہیں ہوتا اِن کی ضمانت نہیں ہونی چاہیے بیگم صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ ذات کے مزدور ہیں اور حرکتیں دیکھیں۔ بہادر علی کو ٹھیک ہونے میں پورے پندرہ دن لگے۔ ابھی بھی خون بہہ جانے سے کمزوری بہت تھی۔ تم ابھی گھر جا کر آرام کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے پھر آ جانا۔ کہاں جاؤں گا بیگم صاحبہ، مجھے یہیں رہنے دیجئے۔ میں جلد ہی کام شروع کر دوں گا۔ ٹھیک ہے آج تمہیں تھانے جانا ہے۔ اپنا بیان ریکارڈ کروا کر آنا۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ وہ تھانے پہنچے۔ حوالات میں قید مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بھوکے ننگے لوگ مزدوری نہ ہونے سے گھروں میں فاقے، حالات خراب، جیل چلے جاتے تو کتنے خاندان بھوکے ننگے ہو جاتے۔ بہادر علی ان کے حالات دیکھ کر ڈر گیا۔

کیا سوچ رہے ہو بہادر علی، بیان لکھواؤ۔ اِن سب کو ٹانگ دوں گا میں۔ آپ اِن سب کو رہا کر دیں۔ کیا!! تھانیدار اور بیگم صاحبہ نے چونک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ میں نے اِن سب کو معاف کر دیا ہے۔ اِن کو رہا کر دیں۔ بہادر علی پھر سوچ لو۔ بیگم صاحبہ اُس کے بیان پر جزبز ہوئیں۔ بیگم صاحبہ آپ سفارش کر دیں۔ تھانیدار صاحب۔ وہ بولا۔ بہت نرم دل کا بچہ ہے۔ مرجاتا تو کون پرسانِ حال تھا پھر بھی اِن ناکام قاتلوں کو معاف کر رہا ہے۔ تو رہا کر دیں۔۔۔ جی کر دیں سب کو رہا۔ ماہا بیگم نے بالآخر اُسے سراہا۔

''او رفیق جا، سب ماں کے جنوں کو لے کر آ''

تھانیدار گرجا۔

سب نہایت خستہ حالت میں شرمندہ کھڑے تھے۔ شکر کرو بندہ بچ گیا ہے اور اِس نے تم سب کو معاف کر دیا ہے مگر میں معاف نہیں کر سکتی۔ آج سے تم میری کوٹھی پر کام نہیں کرو گے۔ صرف بہادر علی کام کرے گا۔ اور شکر کرو بہادر علی تم جیسا نہیں۔ اُس نے تم سب کو معاف کر دیا ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ سب شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ بہادر علی کی قدر کچھ اور بڑھ گئی۔ تم نے اِن سب کو معاف کیوں کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے اُس سے پوچھا۔ بھوک اور پیاس کا ایک خوفناک منظر اُس کی آنکھوں کے آگے لہرا گیا۔ جب اُس کے باپ پر ایسے ہی ایک جھوٹا کیس بنا کر اُسے حوالہ جیل کیا گیا تو پھر پورا گھر بکھر کر رہ گیا۔ بھوک سے بلکنے کا منظر وہ کیسے بھولتا۔ جب وہ کم عمری میں ہی شہر مزدوری کرنے آ گیا کہ باپ کے بعد گھر چلا سکے۔ دُنیا کے سارے دُکھ اُس نے اپنی جان پر سہے کہ بہن بھائی بھوکے نہ رہیں۔ ماں کا سہارا بن گیا مگر اکیلے ہونے کی وجہ سے اُسے کیسی کیسی سختیاں سہنی پڑیں۔ یہ تو صرف وہی جانتا تھا۔ وہ تو نادان تھے مگر دُکھ کی اِس بھٹی سے گزر کر بہادر علی بہادر ہو چکا تھا۔ دو آنسو آنکھوں سے ٹپکے اور دامن میں جذب ہو گئے۔ وہ جان چکا تھا جس کا کوئی نہیں ہوتا اُس کا خدا ہوتا ہے۔ خدا نے ماہا بیگم کو وسیلہ بنا دیا۔ اور خدا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ ترقی کرتا گیا۔ بہن بھائی پڑھ گئے۔ ماں اللہ کے پاس چلی گئی تو اُس نے سب کو اپنے پاس بُلا لیا۔ بہن بھائیوں کی شادیاں کیں۔ وقت نے جوان چہرے پر لکیریں ڈالیں تو ایک دن بیگم صاحبہ نے اُسے اپنے گھر بُلایا۔ تم بھی شادی کر لو اب۔ بہت قربانی دے دی۔ بس بیگم صاحبہ گذر گئی ہے اب تو۔ ارے کہاں ابھی جوان ہو۔ میں خود تمہاری شادی کراؤں گی۔ ایک بہت اچھی لڑکی میری نظر میں ہے۔ تو وہ یک بارگی شرما گیا۔ سب کچھ آپ کا ہی دیا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ۔ میرے منیجر سرور کی بیٹی ہے نائلہ۔ میرے فلاحی ادارے کو چلاتی ہے۔ اُمید ہے تمہیں پسند آئے گی۔ جیسی آپ کی مرضی۔ وہ جھجک گیا۔ یوں بالآخر اُسے بھی خوشی نصیب ہوئی۔ یہ سب تو اللہ کی دین تھی۔ وہ جس کا ہاتھ تھام لے پھر اُس کو کون روک سکتا ہے۔ اور یہ بات بہادر علی کو اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی۔ وہ ان سب کو ڈھونڈ نکالتا جو دُکھ اور غربت کی بھٹی میں پستے تھے اور ہر ممکن سب کی مدد کرتا۔ اللہ نے جو دیا اُس کو لوٹانا بھی تو تھا۔

⦿⦿⦿

ایک خواہش جو پوری نہ ہوئی

ایاز احمد

ریاض ایک دیہاتی لڑکا جو خوش اخلاق نوجوان اور اپنے گاؤں کا نونہار لڑکا اس کی آنکھوں میں کئی خواب تھے شہر میں تعلیم حاصل کر کے ایک بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ جب اس نے انٹر پاس کیا تو اس کے والد نے اسے شہر کے ایک مشہور کالج میں داخل کروایا۔ وہ دنیاداری سے ناآشنا لڑکا کالج میں جب پہلے دن داخل ہوا تو وہ ہاتھ میں تھیلا لیے جس میں اکثر وہ گاؤں میں سبزیاں ایک گاؤں سے دوسرے لے جایا تھا، پاؤں میں اس نے پلاسٹک کی چپل اور میلا سا سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ کالج کی بلند و بالا دیواروں سے بات کرتا ہوا کالج کے اردو ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگا تو فوراً چوکیدار نے اسے گھور کر دیکھا۔

کچھ دیر گھورنے کے بعد اُسے دیکھ کر کہنے لگا

''یہ یونیفارم نہیں ہے تم اندر نہیں جا سکتے۔''

ریاض نے کہا ''کیوں کالج میں داخلہ لیتے وقت تو کہیں ذکر نہ تھا کہ یونیفارم ضروری ہے کہ نہیں۔''

''یہ کوئی بات ہے۔ پینڈو آدمی تمہیں کالج آنے کا سلیقہ نہیں معلوم کہ کیسے آنا ہوتا ہے۔''

ریاض سر ہلاتے ہوئے حامی بھر کر جانے ہی لگا تو چوکیدار بولا ''کوئی چنگا کرتا شلوار پا کے آ''

ریاض نے یہ سن کر سر ہلایا اور فلیٹ کو چل دیا۔

ریاض نے والد کو فون کیا اور کہا ''ابو کالج جانے کے لیے اچھا لباس بھی ضروری ہوتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ لڑکے نے بہاول پور بورڈ ٹاپ کیا ہے۔''

ریاض کے والد نے پوچھا کیا ''مطلب میرے جگر'' ریاض نے حال احوال سنایا۔

تو ریاض کے والد نے کہا ''تو فکر نہ کر میں کچھ کرتا ہوں۔ اک بکری ہے تیرے ماموں کی۔ وہ بیچ دیتا ہوں اگر مان جاتا ہے شام تک تجھے پیسے پہنچ جائیں گے۔''

اگلے دن ریاض جب کالج آیا تو سفید رنگ کا سوٹ جو غالباً پیپر کاٹن، پاؤں میں پشاوری کھیڑی، ہاتھ میں گھڑی ایک چمڑے کا بنا ہوا بستہ، ایک کرن اس کی آنکھوں میں تھی کہ اب مجھے گاؤں کا پہلا گریجویٹ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اس نے اسی دن اردو ڈیپارٹمنٹ جاتے ہوئے ثانیہ کو دیکھا۔ چادر میں لپٹی، کتابیں سینے سے لگائے جیسے کوئی یاد کو سینے میں تھام کر چل رہی ہو اور سہم سہم کر یوں جیسے کہیں ایڑھی نہ لگ جائے اور کچھ خون کے ساتھ بہہ نہ جائے۔

ثانیہ سے کتاب زمین پر گری۔ ریاض نے جھک کر اُٹھائی اور کہا ''آپ کی کتاب''

ثانیہ نے نظریں اُٹھائیں اور ہولے سے کہا ''شکریہ!!'' یہ دو لفظ ریاض کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئے۔

ثانیہ جو کبھی شائستہ اور سنجیدہ طالب ہوا کرتی تھی۔ وقت نے اس کو ایک خود غرض بنا دیا تھا۔ ریاض روز اس کو دیکھنے کی خاطر اس راہ داری پر کھڑا ہوتا اور اُسے دیکھ کر دھڑکنوں پر اختیار کھو دیتا۔

ایک دن جب ثانیہ کی سہیلی عائشہ نے اس سے ریاض کا ذکر چھیڑا تو ثانیہ چپ کر گئی اور آہستہ سے بولی ''میں اب کسی پر اعتماد نہیں کرتی پہلے بھی کیا تھا۔''

اور پھر خاموش ہو گئی۔ مگر چند لمحوں بعد پھر بولی ''زوہیب، شعلہ بیان جس نے خواب دکھائے تھے تو پھر کیا ہوا۔''

عائشہ نے کہا ''ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوتا۔''

ثانیہ نے کہا ''عائشہ وہ دن جب زوہیب نے کہا تھا'' ثانیہ! تم میری نظم ہو اور اس نظم کا مجھے اک اک حرف قیمتی ہے۔'' عائشہ نے کہا پھر کیا ہوا؟

ثانیہ نے بتایا کہ میں اُس کے ساتھ ریلیشن شپ میں آ گئی مگر جلد وہ بدل گیا۔ عائشہ نے کہا کیا اس نے کچھ نہیں کہا جاتے ہوئے۔ اس نے کہا کہ ثانیہ بولی ''میں نے تمہیں چاہا ضرور تھا مگر وہ جذبہ صرف وقتی تھا۔ میں یوں قید میں نہیں رہ سکتا۔ ریاض سب باتوں سے ناآشنا گہری محبت میں مبتلا ہوتا گیا۔ ایک شام ثانیہ اپنا مقالہ کا کام جمع کروانے کے لیے لائبریری میں پروفیسر کو ملنے جا رہی تھی تو ریاض نے دیکھا اور سلام کیا اور کہا:

''میں تمہیں چاہتا ہوں کیا گناہ ہے؟'' ثانیہ نے جواب دیا۔ ''گناہ ثواب تو رب بہتر جانتا ہے۔''

ریاض نے کہا ''چھ چھ گھنٹے بات کرنا پھر کلاس کے بعد فون پہ بات کرنا وہ کیا تھا۔ تم ایسا نہیں کر سکتی۔''

ثانیہ نے کہا ''ہاں...... تو تم کون وہوتے ہو میں ایسی ہی ہوں۔''

ریاض نے کہا ''وہ وقت جو اتنا اچھا گزرا وہ باتیں؟''

ثانیہ نے کہا ''وقت تھا گزر گیا۔ باتیں تھیں میں بھول گئی۔''

ریاض سن کر سکتے میں چلا گیا اور کہا کہ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، یقین کرو اچھا لڑکا ہوں۔''

ثانیہ نے کہا ''میں نہیں مانتی یہ شادی وادی''۔

ریاض نے کہا ''مطلب؟''

ثانیہ نے کہا ''دو بول پڑھنے سے حرام حلال ہو

جاتا ہے۔ ناپاک پاک ہو جاتا ہے۔ اس شادی سے میں ویسے اچھی''

ریاض سن کر زمین پہ گرا اور ہسپتال پہنچ گیا۔ ریاض گاؤں کا پہلا گریجویٹ تو نہ بن پایا مگر گاؤں کا پہلا فرہاد ضرور بن گیا۔ ریاض کا بھائی مشتاق جو شہر میں ایک بڑی کمپنی میں ملازم تھا جب خبر ہوئی تو پہنچا۔ مگر اُس کا بھائی پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔ وہ پرانے گلے شکوے بھول گیا کہ وہ کیوں گھر والوں سے قطع تعلق کر گیا اور اُس کی آنکھوں میں شعلہ جل کر لاوا بن چکا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد جب کالج کھلا تو ثانیہ کی سہیلی عائشہ نے پوچھا کہ تم نے کیوں ہاں نہیں کی اُسے۔ بے چارا بے موت ہی مارا گیا۔ اچھا لڑکا تھا۔

ثانیہ بولی ''میں تو من موجی ہوں۔ میں نہ کروں گی تمام عمر شادی عائشہ نے کہا تو پھر کیا کرے گی؟''

ثانیہ نے کہا ''جو اچھا لگے گا چکھوں گی نا ہیں تو لات دے ماروں گی۔''

عائشہ نے کہا'' دین کا بھی کچھ پاس ہے کہ نہیں؟''

ثانیہ بولی ''کیا دھرم کیا دین میں تو لبرل ہوں لبرل۔''

عائشہ بولی پھر کیا کرے گی۔

ثانیہ نے کہا ''کوٹھی لوں گی، بنگلہ بناؤں گی۔ کاریں لوں گی فلموں میں آؤں گی۔''

عائشہ نے کہا'' مجھے تو تمہاری اس سوچ کا علم ہی نہ تھا کہ تم اتنے بڑے مقام تک پہنچو گی کیسے؟''

ثانیہ نے کہا'' اس کا اچار ڈالنا ہے یہ حسن کس لیے ہے۔''

ثانیہ جو خوبصورتی وحسن سے آشنا تھی۔ کچھ دنوں بعد کالج کا تعلیمی سیشن ختم ہو گیا اور تمام طالب علم الوداع کر کے گھروں کو چل دیا۔ یوں ریاض کی روح بھی اُس کے گاؤں پہنچ گئی۔

ثانیہ کی اماں نے کہا بیٹا شادی کے لیے رشتہ دیکھنے آنے والے ہیں۔ ثانیہ پھٹ پڑی کہا کہ ''شادی کروں، بچے جنوں، عمر سے پہلے بوڑھی ہو جاؤں، ساس سسر کی خدمت کروں مجھ سے نہ ہوگا یہ کہ عمر سے پہلے بوڑھی ہو جاؤں۔''

ثانیہ کو ایک دن فلم ساز کمپنی سے کال آتی ہے کہ آپ کو نئی آنے والی فلم میں بطور ہیروئن رکھ لیا گیا ہے۔ آپ فلاں دن تشریف لائیں۔ ثانیہ نے اماں کو بتایا تو اس نے اماں سے کہا۔

''شریف گھروں کی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں یہ کام اچھا نہیں ہے۔''

ثانیہ نے کہا'' کیا اچھا ہے کیا برا ہے میں جانتی ہوں۔ اجازت نا ہیں لے رہی بتا رہی ہوں۔''

شوٹنگ سیٹ پر پہنچ کر اُسے کہا گیا کہ تم جب پہنچ جاؤ تو کال کرنا ثانیہ نے کال کی۔

''آپ نے جہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ میں پہنچ گئی ہوں۔''

فون سے آواز آئی ''تم لاسٹ فلور یعنی 8th فلور پر آ جاؤ پھر کال کرنا۔''

ثانیہ جب پہنچی تو وہاں بالکنی پر کھڑی ہو گئی تو اُس کو پیچھے سے کسی نے دھکا دیا اور گر کر مر گئی۔

فون اُٹھا کر کسی نے کہا'' یس باس I did it''

ریاض کے بھائی مشتاق کا لاوا یوں اختتام کو پہنچا۔ اگلے روز اخبار میں خبر چھپی گھریلو حالات سے تنگ آ کر لڑکی نے خودکشی کر لی۔''

⊙⊙⊙

جس کو ہو گئی دل سے آگہی قلندر کی
اس تلک ہی پہنچی ہے روشنی قلندر کی

رازِ ہست کو سمجھا راز بود کو جانا
دید جس کے چہرے پر پڑ گئی قلندر کی

خاک زاد تھا لیکن عرش پر اسے دیکھا
جس نے زیست میں پائی اک گھڑی قلندر کی

پھول کھل گئے ہر سو پھیلتی گئی خوشبو
دشت سے یونہی میں نے بات کی قلندر کی

جو بھی ہے ادا دیکھی اس کی انتہا دیکھی
سادگی سے بھی سادہ، سادگی قلندر کی

پاس رہ کے دیکھو گے تو خود ہی جان جاؤ گے
دین کا خلاصہ ہے زندگی قلندر کی

جس جگہ بھی ہوتا ہوں خود میں اب نہیں ہوتا
رکھتی ہے مجھے بے خود، بے خودی قلندر کی

ہم ہیں رنگ میں اس کے ہم ہیں ڈھنگ میں اس کے
وہ خوشی ہماری ہے جو خوشی قلندر کی

کامیابی نے اس کے چومے ہیں قدم ہر جا
جس نے بھی ظفر کی ہے نوکری قلندر کی

انجینئر ظفر محی الدین

کمالِ فقر میں مخفی ہے شانِ سلطانی
عیاں، نہاں کے ہے مابین تن قلندر کا
جہانِ دیدہ و دل میں ہے شعلۂ رنگیں
ظفر تو تھام کے رکھ پیرہن قلندر کا

انجینئر ظفر محی الدین

CamScanner

افسانہ

دھکا اسٹارٹ

جاوید جواد حسین/کراچی

شکیل کی بے ربط زندگی میں کئی واقعات ایسے رونما ہوئے تھے کہ جیسے خزاں میں چپکے سے بہار آجائے یا جیسے گرم ہواوں کے تھپیڑوں میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آجائے۔کارزار حیات سے نبرد آزما، زندگی بنا حوادث کے کچھوے کی طرح رینگ رہی تھی۔سوچوں میں گم "اکثر دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنے کاروبار میں جٹے رہتے ہیں اور انہیں فرصت ہی نہی ہوتی اور ایک میری قسمت ہے کہ کبھی ایک آرڈر مل بھی جائے تو اگلے آرڈر کا کہیں دور دور تک پتہ نہی ہوتا، کیا میں کسی معجزے کے انتظار میں رہتا ہوں۔ "اپنی زبوں حالی سے پریشان ایسے ہی ایک دن دوپہر کے وقت اکیلا بیٹھا ٹیبل پر پڑے پانی کو اپنی انگلی سے کبھی ادھر کرتا تو کبھی ادھر، کبھی پانی کو نیچے گرا دیتا تو کبھی گرنے سے روک لیتا۔ پھر پیچھے ہٹ کر کرسی سے پشت ٹکا کر اپنے گودام کی چھت کو گھورنے لگا۔چھت کیکونیکھدرے مکڑی کے جالوں سے اٹے پڑے تھے۔چھت کتنی جگہوں سے پلاسٹر سے بے نیاز ہوتی جارہی تھی۔ بائیں دیوار پر لگی دیمک جیسے کاروبار کے طول وعرض پر چڑھ رہی تھی۔شکیل کا یہ گودام شہر کے بیچو بیچ تو تھا لیکن انتظامیہ کی بے توجہی اور ناقص انتظامات اور گندگی کی وجہ سے ناکامی سے دوچار تھا۔گاہکوں کا رجحان بہت ہی کم تھا۔اس عمارت کے اندر کئی دوسرے گودام بھی تھے لیکن وہ زیادہ تر بند ہی رہتے تھے۔اور مارکیٹ کی پچھلی گلیوں میں روشنی کا مناسب انتظام نہ ہونے کے سبب اندھیرا ہی چھایا رہتا تھا۔اس لئے کوئی بھولا بھٹکا گاہک یا پھر کوئی جان پہچان والا ہی شکیل تک پہونچ پاتا تھا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے بہت دیر گزر چکی تھی کہ اسے اپنے پیچھے کسی چیز کے گھسٹنے کی آوازیں آنے لگیں، گھوم کر دیکھا تو ایک بوڑھا فقیر، گنجا سر، گلے میں ڈھیروں مالائیں، گھٹنوں تک سبز رنگ کا چغا پہنا ہوا۔ایک کان میں بالی۔رنگ قدرے سانولا، ہاتھ میں لاٹھی پکڑے اور ایک ٹانگ کو گھسیٹتے ہوئے اس سے سوال دست دراز کیا۔شکیل نے فورا جیب میں پیسوں کا اندازہ لگایا تو چپکی سادھ لی کہ پبلک ٹرانسپورٹ سے گھر تو چلا جاوں۔یا پھر اس فقیر کو دے دوں تو گھر کیسے جاوں گا۔ "بابا معاف کرو"۔ "بھوک لگی ہے کھانا کھلا دے "بابا جی نے دوسری راہ سجھائی۔نہ جانے ایکدم کیا سوجھی کہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور جو کھانا گھر سے لایا تھا وہ اس فقیر کو دیدیا۔فقیر وہیں چند قدم پیچھے ہٹ کر زمین پر بیٹھ کر سالن کی تھیلی کھول کر کھانے لگا۔ "بیٹا اس میں سالن تو ہے پر روٹی نہی ہے"۔"بابا جی۔۔روٹی باہر ہوٹل سے لے لو"۔لیکن وہ بوڑھا فقیر اپنی لنگی کو لپیٹ کر وہیں فرش پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ بابا جی نے کھا چکنے کے بعد شکیل کے کندھے پر شاباشی دی۔ "دیکھ بیٹا۔۔۔کدی وی نیکی کرن اچ دیر نہ کری، لوکی نیکیاں کرنیاں پل گئے نے۔اللہ دی راہ اچ خرچ کردا ریا کر۔کیوں !اواس لئی کہ جتھوں نکلدا ائی تو اوتھے پیندا وی نئی۔منگن آلیاں اچ فرق نہ پاویں۔بس دیندا ریا کر۔ اللہ تیرے کاروبار اچ برکت پاوے گا "،(دیکھ بیٹا۔ کبھی نیکی کرنے میں دیر نہ کرنا۔لوگ نیکیاں کرنا بھول گئے ہیں، جس جیب سے نکلتا نہیں اس میں ڈلتا بھی نہی۔فقیر خواہ کیسا بھی ہو بس دیتا جا، اللہ تیرے کاروبار میں برکت دے گا) ۔فقیر نے گودام کے عین سامنے کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ کھڑے کر کے دعائیں دیں۔ فقیر کے جانے کے بعد شکیل کے دل کو بے حد طمانیت اور سکون کا احساس ہوا " کوئی بات نہیں یار، شام میں گھر جا کر کھالوں گا۔ "پھر شام کے سائے ابھی لمبے نہ ہوئے تھے۔ہوا میں خنکی اور تیزی بڑھتی جارہی تھی۔ سردی بھی اپنا رنگ دکھانے لگی مایوس دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے گودام کا شٹر گرانے ہی والا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی خوش نما لباس پینٹ کوٹ ٹائی پہنے، خم دار کمر اور چہرے پر بردباری لیئے، اسی کی طرف آرہا تھا۔کوئی ریٹائرڈ آفیسر لگ رہا تھا۔اس نے گودام کا جائزہ لیا پھر شکیل کے ساتھ کچھ معاملات طے کئے۔ "سر کنچا مال دوں گا سر کنچا، بلکل ایک نمبر۔آپ بے فکر ہو جایئے۔ "گاہک نے مال کا آرڈر دیا۔ایڈوانس دیا اور چل دیا۔اتنے بڑے اور غیر متوقع آرڈر کا تو شکیل سوچ بھی نہی سکتا تھا۔کافی عرصے کے بعد لاکھوں کا آرڈر آیا تھا۔شکیل حیرانگی سے ان صاحب کو پیچھے سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ "یہاں تو کوئی پرندہ پر نہی مارتا، یہ صاحب کیسے آگئے یقیناً کسی نے میرا پتہ بتایا ہوگا"۔ بہرحال شکیل نے وعدے کے مطابق ایک ہفتے میں آرڈر ان کے حوالے کیا۔شکیل نے بعد میں کئی دنوں تک اس بوڑھے فقیر کی تلاش جاری رکھی لیکن بے سود۔شکیل کے ہاتھ منافع کے طور پر جو رقم لگی اس سے زندگی کچھ عرصے کے لئے تو رواں دواں ہوگئی۔لیکن یہ متحرک وقت کچھ عرصہ تو حرکت میں رہا لیکن پھر گھڑی کی سوئی رک سی گئی۔وقت کی رفتار ایک نئی نیکی کی متقاضی تھی۔ وہ جو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا سا آیا تھا۔پھر گرم ہوا میں تبدیل ہوگیا۔گھر کے اخراجات پھر سانپ کے پھن کی طرح سر اٹھانے لگے۔ پینٹ کی جیب ٹٹولی کہ گھر جانے کے لئے بس کا کرایہ ہے بھی یا نہی۔ پھر اٹھ کر گودام کو تالا لگایا اور بس اسٹاپ پر پہونچ گیا۔پھر وہی منحوس بس کا سفر، مدھم بلب کی اداس کر دینے والی روشنی منحوس بس کی بریکوں کے جھٹکے۔اف میرے خدا

کبھی میرے بھی حالات بدل دے۔ منحوس بس کے چھت سے لگے پائپ کو پوری قوت سے پکڑنا اور پھر آگے پیچھے دھکے لگنا، بیٹھنے کے لئے سیٹ کی دھکم پیل، روز روز کی اس رسہ کشی سے دل اکتا گیا تھا۔ سڑک پر دوڑتی ہوئی تیز رفتار گاڑیوں کے اندر بیٹھے لوگوں کی عیش ونشاط سے بھرپور زندگی۔۔۔ چھوڑ یار۔۔۔ کن سوچوں میں پڑ گیا۔۔۔ بس کے کنڈیکٹر پر نظر پڑی جو مسافروں کے بٹوں کو مسلتا، زبردستی دباتا ہوا جب شکیل کے پاس آیا تو جیب میں ہاتھ ڈالا تو ششدر رہ گیا اور خالی جیب کو ٹٹولتے ہی رہ گیا۔ کنڈیکٹر سے آنکھیں چار ہوئیں تو گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ شکیل نظریں پائپ پر جمے ہوئے ہاتھوں پر جما کر کن انکھیوں سے کنڈیکٹر کو اور کبھی بہانے سے دونوں بازوؤں کے بیچ میں سے سر آگے کو نکال کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کنڈیکٹر نیا شارہ کیا تو دوبارہ جیب کو ٹٹولنے لگا۔ "ارے یار لگتا ہے کہ کسی نے جیب مارلی میری "، "چلو چلو نیچے اترو بہت دیکھیں تمھارے جیسے"۔ جہاں دیدہ کنڈیکٹر نے ایک نہ سنی۔ شکیل کھسیانا سا ہوکر دو اسٹاپ پہلے ہی اتر گیا۔ اگلے دن تو گودام کے آس پاس کے مزدور بھی بے ایمانی کرنے پر اکسانے لگے تھے۔ کہ بنا بے ایمانی کے تم مال کما نہی سکتے۔ کاروبار کرنا بھی ایک فن ہے اور یہ فن تم نہی جانتے۔ اور ہاں خیرات شیرات بھی کرتے ہو یا نہی۔۔۔؟ "پھر ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ شکیل کو شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔ سوچا کچھ ایسا مل جائے کہ ہلکا پھلکا پیٹ بھی بھر جائے اور پیسے بھی کم لگیں۔ بیکری سے ایک پیٹیس لیا اور چائے کے ہوٹل میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز آئی، پچاس روپیہ دو"۔ مڑ کر دیکھا تو تیرا چودہ سال کا لڑکا تھا۔ بہتی ناک کے ساتھ مونہہ لٹکائے ہاتھ پھیلائے شکیل کے پیچھے پیچھے داخل ہوا تھا۔ "پچاس روپیہ دو"۔ "کیوں دوں بھائی، تو کون اے بے، بیٹھنے بھی دے گا یا نہی"۔ شکیل جھنجلا کر بولا تو وہ لڑکا ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ شکیل ہر وقت کے پریشان کن حالات کی وجہ سے سخت گیر ہو چکا تھا۔ اتنے میں ہوٹل کا بیرا اس فقیر لڑکے کو ہلکے پھلکے دھکے دیتا ہوا باہر لے گیا۔ "یہ مجھے چور لگ رہا ہے زرا نظر رکھنا اس پر"۔ شکیل قدرے زور سے غصے میں بولا۔۔ "کمال اے یار، پہلے میں اپنا پیٹ بھروں گا یا تیرا، میں نہ کھاؤں تو کھالے پہلے سالے"۔ شکیل بڑبڑا رہا تھا۔

پیٹیس کو چھوڑا اور بنا چبائے ہی نگل گیا پیٹیس باسی تھا۔ سوچا بھی کہ جاکر پیٹیس واپس بیکری والے کے مونہہ پر دے مارے۔ لیکن غصے کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بدمزہ چائے ڈکاری تو دل چاہا کہ کاونٹر پر بیٹھے بندے کے سر پر انڈیل دے۔ کیا کروں یار گھر پر بیگم کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہی۔ خود کو نارمل کرنے کوشش کرنے لگا۔ تھوڑا سا سکون محسوس ہوا تو سہی لیکن ایک افسوس دل کے ساتھ ساتھ دھڑکنے لگا۔ اور اب یہ خیال زور پکڑتا جا رہا تھا کہ اس فقیر بچے کو پیسے دے دینے چاہیئں۔ شکیل نے دیکھا کہ وہ لڑکا باہر بیٹھا مسلسل اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ اور ایک ہاتھ سے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "بے غیرت نے نظریں یہیں جمائی ہوئی ہیں، نظر لگا کے ہی چھوڑے گا "۔ شکیل پھر آپے سے باہر ہونے لگا۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر شکیل کو دوبارہ اس پر غصہ آنے لگا

ہوٹل سے نکل کر شکیل جانے لگا تو وہ شکیل کی طرف ہی آنے لگا۔ "ابے تو تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے "

اور یہ کہتے ہی شکیل تیزی سے آگے نکل گیا۔۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا۔ تو منفی سوچ سے مثبت کی طرف سوچنے لگا۔ "ارے یار کچھ دے ہی دیتا اس بیچارے کو۔ اللہ تعالٰی بھی ناراض ہو رہے ہونگے"۔ اس لڑکے کا بجھا ہوا چہرہ دل و دماغ پر چھانے لگا اور بے چینی بڑھتی گئی۔ "اس کو اپنے ساتھ ہی ٹیبل پر بٹھا کر کھلا دیتا تو مزہ ہی کچھ اور آتا اور یوں ملال بھی نہ ہوتا۔ اور میں نے جھڑکا بھی تو بہت برا تھا نا، "تو افسوس کا سیاہ دائرہ پھیلتا ہی چلا گیا۔ شکیل نے سوچا جب تک میں اس فقیر بچے کو کچھ دے نہ دوں گا تب تک یہ ملامت جاتنگی نہی۔ گناہ کا احساس لیئے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ فقیر بچہ کسی ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ بیٹھا چائے بسکٹ نوش کر رہا تھا۔، وہ فقیر بچہ کسی آدمی کے ساتھ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس آدمی نے شکیل کو نظر بھر کر ایک لمحے کے لئے دیکھا اور دوبارہ اپنے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ یک لخت اس شخص کا فون بجنے لگا۔ اور وہ کھڑا ہو کر کسی سے بہت پرجوش انداز میں باتیں کرنے لگا اس نے بچے کے سر کے بالوں کو پیار کے انداز میں بکھیرا۔ شکیل گھر لوٹ آیا۔ بیگم نے کریدا لیکن کبھی کبھی جواب نہ دینے کی غرض سے کان بند کر لینے چاہیئے۔ اور جی میں آیا کہ سارا غصہ بیگم پر ہی نکال دوں۔ اس ادھیڑ عمر آدمی کے فون پر ہونے والی گفتگو اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھی۔ "بس سرا بھی آیا۔ آپ پیمنٹ تیار رکھیں۔ سرگارنٹی کے ساتھ کنچا مال دوں گا کنچا، آپ بے فکر رہیئے۔ "اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ " کنچا مال دوں گا سر کنچا مال۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے ۔۔۔ دس لاکھ کا آرڈر "۔ لیکن وہ تھا کون۔؟ ہو بہو میرے ہی الفاظ تھے! "۔ کیا دنیا میں بہت سے لوگوں کی زندگی بھی دھکا اسٹارٹ کی مرہون منت ہوتی ہے"۔

⊙⊙⊙

CS CamScanner

نام کتاب : 999 ٹریلین ڈالر کی کتاب

مصنف : علامہ عبدالستار عاصم

تبصرہ نگار : انوار احمد بگوی

صفحات : 248

ناشر : قلم فاؤنڈیشن، انٹرنیشنل

ننانوے 99 کا چکر تو سنا تھا کہ انسان پورا سو کرنے میں زندگی تیاگ دیتا ہے، لیکن علامہ عبدالستار عاصم نے اسے 999 بنا دیا ہے۔ یہ ایک نیا محاورہ ہے جو ان کی تازہ کتاب ''999 ٹریلین ڈالر کی کتاب- دولت سے آگے کا سفر'' کا نام ہے۔ اس کتاب میں دنیا بھر کی 101 شخصیات کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنے علم اور اپنے کردار سے انسانوں کو متاثر کیا اور انسانیت کی بہبود کے لیے فکری اور اچھوتی رہنمائی عطا کی۔ کتاب کے نام میں ہندسے اس امر کے غماز ہیں کہ جو بھی ایک ہزار پورا کرنے کے چکر سے باہر نکل کر سوچتا ہے وہ کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ پھر وہ آفاقی ہو جاتا ہے۔ وقت اور حوادث اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ اس کی خدمات گویا امر ہو جاتی ہیں۔

علم و حکمت کسی ایک قوم یا خطے کی میراث نہیں ہے۔ یہ آسمانی رحمت ہے جو بارش کے قطروں کی مانند کسی تقسیم کے بغیر عطا ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو فطرت سے عقل و خرد اور تدبر و تفکر کا ملکہ لے کر پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی محنت، لگن اور ہمت سے بے مثال کامیابیوں سے ہم کنار ہوتے اور ایک عالم کو فیض یاب کرتے ہیں۔

کارخانۂ قدرت فطرت کے عجائبات سے بھرا پڑا ہے۔ انسانی دماغ ایک عجوبہ، ایک طلسم ہوشربا ہے۔ اس دماغ میں 86 ارب نیوران ہوتے ہیں جو سوچنے، کھوجنے، یاد رکھنے، تخلیق کرنے، عمل پیرا ہونے اور زندہ رہنے کے لیے مختلف محرکات اور احکامات کنٹرول کرتے ہیں۔ علامہ عبدالستار عاصم کی کتاب کروڑوں انسانوں میں سے چند گنے چنے دماغوں کے کارناموں کی داستان ہے جنہوں نے انسان کی تاریخ میں محیر العقول کارنامے سرانجام دیے ہیں اور علم و فن، سائنس اور آرٹ میں تہذیب و تمدن کے دھارے بدل دیے۔

بلاشبہ اس دلچسپ کتاب کو عام پھیلانے کی ضرورت ہے۔ مسلسل بارش کی مانند علامہ عبدالستار کتابوں کو شائع کرتے چلے جاتے ہیں۔ کتابیں ہی کتابیں۔ نجانے وہ اپنے دفتر میں کہاں بیٹھتے ہیں کیونکہ وہاں تو ہر طرف کتابوں کا ڈیرہ ہے۔ مختلف موضوعات پر لاتعداد کتابیں جن کا شمار اب نہ ان کو یاد ہے اور نہ شاید ان کے رفقاء کو تازہ ان کی تالیف کا موضوع ایک بار تو چونکا دینے والا ہے۔ اس میں ہر قوم، دیس دیس کے اہلِ علم اور اہلِ فن کے کارناموں کا ذکر ہے۔ جنہوں نے اپنے مقصد کے لیے اپنی توانائیاں صرف کیں اور اپنی تحاریر اور تحقیقات سے دنیا کو بہت کچھ دیا۔

کتاب کیا ہے؟ افکارِ عالم کا نگار خانہ! کتاب کیا ہے؟ انسان کے فکر و عمل کی بوقلمونی!

کتاب میں القاسم الزہراوی اور البرٹ آئن سٹائن، بل گیٹس سے ایلون مسک، مائیکل انجیلو، مولانا مودودیؒ، نیلسن منڈیلا، نیل آرم سٹرانگ تک......

ہر قوم اور ہر عہد کے علماء اور محققین، موجدین اور مفکرین کا ذکر ہے۔ جنہوں نے انسانوں کی زندگی سے جڑے کاموں کو اپنی تحقیق اور تدبیر سے موضوع بنایا ہے۔ یہ سب تب ممکن ہو سکا ہے جب انہوں نے ننانوے کے چکر سے باہر نکل کر دنیاوی دولت سے آگے کا سفر کیا ہے اور یہی ان کی کامیابی کی سنہری کلید اور ان کی عظمت کا راز ہے۔

اس کتاب کی تدوین کا مقصد آج کی نئی نسل Gen Z کو باور کرانا ہے کہ نہ علم کی کوئی حد ہے اور نہ محنت اور کوشش کی انتہا، اگر وہ اردو متن یا Chat GPT سے انگریزی زبان میں ترجمہ پڑھنے کے لیے وقت نکال لے تو اس کتاب میں اس کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا بڑا سامان ہے۔ تحقیق و تفتیش، تدبر و تفکر، ایجاد و اختراع کو کیونکر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ وہ کام جو ذات کے لیے، ملک و قوم کے لیے اور نوعِ انسانی کے لیے باعث خیر و فلاح ثابت ہوں۔

⊙⊙⊙

مزاحیہ تضمینی غزل

(مرزا غالب کی غزل کے مصرعوں پر)

داڑھی سفید دیکھ کے اندازہ مت لگا
''عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا''
شادی کے بعد پہلی سی چاہت نہ کر طلب
''جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا''
سنسد بھون میں آ کے سبھی چیخنے لگے
''یاں امتیازِ ناقص و عاقل نہیں رہا''
شادی سے قبل ہی سے ہوں سسرال میں مقیم
''ہوں شمعِ کشتہ در خورِ محفل نہیں رہا''
بیگم کی ایک ڈانٹ ہے کافی مرے لیے
''شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا''
زُلفِ سفید تجھ کو میں کرتا رہا سیاہ
''لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا''

افتخار راغب/ریاض، سعودی عرب

ادبی تقریبات

ماہنامہ ادب لطیف کی 90ویں سالگرہ ، اردو ادب در تحریروں کے ترجمان ماہنامہ ادب لطیف کی کے 90 سال مکمل ہونے پر محترمہ تولیہ انیس کے زیر اہتمام فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ممتاز شاعرہ اور دانشور ڈاکٹر سعادت سعید نے کی جبکہ ممتاز نقاد نگار محترمہ عذرا اصغر اور خواتین یونیورسٹی ملتان اکٹر شگفتہ حسین مہمانان خصوصی تھیں۔ نظامت فرائض ادب لطیف کے مدیر اور ممتاز ادیب ب دوست اور دانشور مظہر سلیم مجوکہ نے نہایت اسلوبی سے انجام دیئے۔تقریب کا آغاز تلاوت پاک سے شروع ہوا۔ حسنین مظہری نے تلاوت عدنعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا نذرانہ پیش کیا یب کے آغاز میں ادب لطیف کے آغاز سے تک پر مشتمل ایک ڈاکومنٹری پیش کی گئی ادب کے نائب مدیر میجر شہزاد نیر نے ادب کے مختلف ادوار پر تفصیل سے روشنی ڈالی یب میں ڈاکٹر سعادت سعید، نذیر قیصر محترمہ اصغر، ڈاکٹر شگفتہ حسین، غلام حسین ساجد اقتدار یہ ڈاکٹر جواز جعفری شاہد بخاری ظفر معین بلے ,نوید مرزا اور آخر میں میزبان تولیہ انیس خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ادب لطیف کی تاریخ , ادب اور اردو زبان کی خدمت اور اس کے معیار کے علاوہ ادب لطیف سے اپنے عشق کا اظہار کیا مقررین نے ادب لطیف کے مدیر مظہر سلیم مجوکہ کے دور ادارت کو ادب لطیف کا زریں دور قرار دیتے ہوئے ان کی بے لوث ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور ادب لطیف کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا کی آخر میں میزبان محترمہ تولیہ انیس خان نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی خوبصورت یادوں سے قارئین کو آگاہ کیا اور مہمانوں کو ہائی ٹی کی دعوت دی۔تقریب : تقریب میں ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والی خوبصورت اور معتبر شخصیات نے شرکت کی جن میں باقی احمد پوری کرامت بخاری فرخ سہیل گوئندی۔

توقیر احمد شریفی، ڈاکٹر شاہد اشرف تاثیر نقوی اشرف جاوید، عابدہ قیصر میاں شہزاد آفتاب جاوید حفیظ طاہر، اسد فاطمی جاوید اقبال کارٹونسٹ مختار عظمی بختیار علی سیال ناصر نقوی نذر بھنڈر ایوب عاقی حسین۔ ثاقب کاشف منظور جاوید انور بو بک فرح رضوی۔ فضل عباس رضوی شاہین اشرف علی نائلہ عابدہ صائمہ - ناب نیلم احمد بشیر، ڈاکٹر صائمہ ارم واحد سہیل روقیہ آفتاب اکبر چوہدری کے علاوہ کثیر تعداد میں ادب سے محبت کرنے والے شریک محفل تھے۔اس خوب صورت۔ تقریب میں لاہور شہر کی علم وادب کی کریم کی شمولیت۔ادب لطیف کی خدمات پر اعتماد اور مدیران کی۔

❀❀❀

مورخہ 19 اپریل بروز اتوار صبح گیارہ بجے ایک شعری نشست کا اہتمام محترم حسن عسکری کاظمی صاحب کے ہاں کیا گیا۔ اس نشست کی صدارت محترم ومکرم جناب ڈاکٹر یوسف شاہد نے فرمائی ۔ ڈاکٹر یوسف شاہد صاحب نے اپنی نئی کتاب گیسوئے پرنم کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا۔ دیگر احباب نے اس نشست میں اظہار فرمایا۔اس نشست میں محترم حسن عسکری کاظمی صاحب۔ جناب پروفیسر فرخ محمود جناب طارق واصفی۔ جناب کرامت بخاری جناب حسن عسکری کاظمی کے علاوہ دیگر احباب نے شرکت کی۔ پروگرام کے کھانے پینے کے لوازمات سے شرکاء کی تواضع کی گئی۔

❀❀❀

ادبی تنظیم بزم محبت جلال پور جٹاں کے زیر اہتمام بروز اتوار 19 اپریل 2026 کو مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا ہے۔تقریب کی صدارت معروف شاعر پروفیسر ارشد شاہین کی جبکہ مہمان خصوصی خوب صورت لہجے کے شعراء محترم ایوب صابر، محمد آصف علوی (سیال کوٹ) اور نذر حسین ناز (چکوال) تھے۔مہمان اعزاز شعرائے کرام میں پروفیسر کلیم احسان بٹ، مہدی چوہان، سید غلام مجتبیٰ، عثمان عبدالقیوم، آرب ہاشمی، فیضان فیض، ظہیر مہروی، ثانی صدیقی، صدیق ناصح، راشد منصور، راشد اللہ بٹ، عبدالقدیر گلفام، حسنین پرویز، تنویر دانش، ظہیر عباس، عمر بن مرتضی اور شوکت علی شوکت تھے یہ تقریب بٹ فارم ہاؤس سیالکوٹ روڈ جلال پور جٹاں میں منعقد ہوئی۔تقریب دو ادوار پر مشتمل تھی۔ پہلا دور ممتاز شاعر فیض الحسن ناصر کی یاد میں تعزیتی اجلاس پر مشتمل تھا جس میں ممتاز شاعر اشفاق شاہین ظہیر مہروی اور پروفیسر غلام مجتبیٰ نے اظہار خیال کیا اور مرحوم کے دعائے مغفرت کی گئی اس کے بعد شہزاد احمد شاذ صاحب کی والدہ محترمہ کے لئے بھی دعائے مغفرت کی گئی اور فاتحہ خوانی کی گئی ۔ بعد ازاں شعری دور میں شعرائے کرام نے کلام پیش کیا بزم محبت کے سرپرست ندیم اسلم بٹ جبکہ نائب صدر ڈاکٹر احسان محسن اور صدر اشفاق شاہین تھے۔

مشاعرہ کی ابتدائی تصاویر شیئر کی جا رہی ہیں باقی تصاویر اور وڈیوز جلد آن ائیر کر دی جائیں گی۔

❀❀❀

ادبی تنظیم مجلسِ مریدینِ جوشؔ کے زیر اہتمام ایک شام اظہر عباس خان کے نام کا اہتمام اتوار انیس اپریل کی دوپہر میزبان جناب عمران کھرل کے دولت کدہ پر کیا گیا جس میں شعرائے کرام کی کثیر تعداد نے

CS CamScanner

شرکت کی۔ سب سے پہلے ذکر ہوگا عمران بھائی کی میزبانی کا، ایسے فراخ دل میزبان کم کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں انہوں نے لائیو لنچ کا اہتمام کر رکھا تھا مشاعرہ سے پہلے ہی کھانے کا اہتمام کیا گیا جس سے حاضرینِ محفل نے خوب انصاف کیا، اس شاندار میزبانی پر عمران بھائی کا خصوصی شکریہ۔ کھانے کے بعد مشاعرہ کا آغاز کیا گیا، تقریب کی صدارت سینئر شاعر جناب اعجاز کنور راجا نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ہمارے میزبان جناب عمران کھرل کے ذمہ رہے۔ تقریب کے دولہا اظہر عباس خان تھے۔ دیگر شعرائے کرام میں قاسم مقصود، سعادت علی سعدی، فارحہ نوید، فوزیہ حسین، عنبرین خان، فرح خان، طاہر ناصر علی، باصر زیدی، ڈیوڈ پرسی، منزہ سحر، خالد آشفتہ، ثقلین جعفری، عطا العزیز، فرہاد ترابی، سید ضیا حسین، نسیم الرحمان روشن، بیا جی، وسیم عباس، حسنین اختر، محمد عباس مرزا، عرفان صادق، دانش عزیز، احتشام حسن اور صغیر احمد صغیر شامل تھے۔ شعرائے کرام نے بہت عمدہ کلام سنایا، ہمہ وقت داد و تحسین کی آوازیں گونجتی رہیں، عمران کھرل بھائی کی شگفتہ میزبانی بھی شاندار رہی۔ دبستانِ لاہور میں گھروں پر شعری نشستوں کی معدوم ہوتی روایت کو بھائی عمران کھرل نے زندہ رکھنے کی اہم کوشش کی ہے جس کے لئے وہ اور احتشام بھائی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ تقریب ہمیشہ ہماری یادوں کو مہکاتی رہے گی، بارِ دگر منتظمین کا شکریہ۔

❁❁❁

اسلام آباد، 28 اپریل 2025ء : گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونی ورسٹی، بہاولپور کی وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شازیہ انجم نے جناب شاکر علی کے ہمراہ صدر نشین اکادمی ادبیاتِ پاکستان، پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف سے اکادمی کے مرکزی دفتر اسلام آباد میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں جامعات میں ادبی سرگرمیوں کے فروغ، طلبہ میں تخلیقی شعور کی ترویج اور قومی سطح پر ادب کے استحکام کے لیے مشترکہ کاوشوں پر تبادلہ خیال ہوا۔

گفتگو کے دوران میں مستقبل میں مشترکہ علمی و ادبی پروگرامز کے انعقاد اور خصوصی طور پر اقبال چیئر کے قیام و استحکام، فکرِ اقبالؒ کی ترویج، اور نئی نسل کی فکری رہنمائی کے حوالے سے مختلف تجاویز پر اتفاق کیا گیا۔ اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ علمی و ادبی مکالموں، سیمینارز اور تحقیقی سرگرمیوں کے تسلسل سے معاشرے میں فکری بالیدگی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

ملاقات کے اختتام پر پروفیسر ڈاکٹر شازیہ انجم نے اپنی جامعہ کی جانب سے ادبی و علمی سرگرمیوں کے فروغ کے عزم کا اعادہ کیا، جبکہ پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اکادمی کی مکمل معاونت کی یقین دہانی کرائی اور مہمانوں کو اکادمی کی مطبوعات پیش کیں۔

❁❁❁

(اسلام آباد پ۔ر) اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام مقبول ہفتہ وار ادبی سلسلے "چائے، باتیں اور کتابیں " کی 76 ویں غیر رسمی نشست عالمی یومِ خواتین کے موقع پر بعنوان "عصرِ حاضر کی پاکستانی خواتین اہلِ قلم : تخلیقی بصیرت اور سماجی شعور " کمیٹی روم نمبر 1 0، اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ نشست کا آغاز خواتین کے حقوق، سماجی رویّوں اور درپیش رکاوٹوں کے موضوع پر بامقصد گفتگو سے ہوا۔

معروف صحافی و اہلِ قلم فریدہ حفیظ اور افشاں عباسی نے عالمی یومِ خواتین کی اہمیت اور معاشرتی تناظر میں خواتین کے کردار پر سیر حاصل اظہارِ خیال کیا۔

صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی گفتگو میں کہا کہ خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ نہ صرف فعال کردار ادا کر رہی ہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوا رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادبی میدان میں خواتین کی تخلیقی توانائی، فکری گہرائی اور سماجی شعور قابلِ تحسین ہے، تاہم اس نمائندگی کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ غیر معمولی ہنر کبھی پوشیدہ نہیں رہتا، البتہ ابھرتے ہوئے اور درمیانے درجے کے لکھاریوں کو آگے آنے کے لیے مسلسل محنت، فکری ریاضت اور تربیت درکار ہوتی ہے۔ انھوں نے نوجوان قلم کاروں کو مشورہ دیا کہ وہ مطالعہ کا ذوق اپنائیں، کلاسیکی اور معاصر ادب سے استفادہ کریں اور اپنے فکری دائرے کو وسعت دیں۔

منیر فیاض نے ادب میں وجودِ زن کے تاریخی، سماجی اور ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ رفعت انجم نے نعتِ رسولِ مقبول ؟ پیش کی۔ باچا خان یونیورسٹی چارسدہ کی پی ایچ ڈی اسکالر مہرانساء نے پشتو ادب میں خواتین کے کردار پر تحقیقی گفتگو کی۔

ڈاکٹر مہناز انجم نے نواحی علاقوں کی خواتین کو درپیش مسائل کا ذکر کیا اور اپنی نظم سنائی، جبکہ افشاں عباسی نے بھی اپنی نظم پیش کرتے ہوئے زندگی کے سفر میں پیش آنے والے واقعات بیان کیے۔

مقررین نے اس امر پر زور دیا کہ عورت کے بغیر زندگی ادھوری ہے اور معاشرے میں خواتین کی تکریم و احترام ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر بی بی امینہ نے کہا کہ سماجی رکاوٹوں کے علاوہ خواتین کو ادب کے تنقیدی اور تحقیقی میدان میں بھی مختلف مسائل کا سامنا ہے۔ داؤد کیف نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی بطور چیئر پرسن تقرری کے بعد اکادمی کی ادبی تقریبات میں موضوعاتی تنوع اور فکری وسعت دیکھنے میں آئی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی ممتاز ادیباؤں جیسے خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، فریدہ حفیظ، کشور ناہید اور دیگر شخصیات کے ادبی اثرات کا بھی ذکر کیا۔

نشست میں ڈاکٹر نجیبہ عارف، فریدہ حفیظ، افشاں عباسی، منیر فیاض، ڈاکٹر بی بی امینہ، محمد عبدالمتین ہاشمی، حسیبہ بلوچ، یوسف خان، محمد جمیل مغل، محمد وسیم فقیر، ڈاکٹر مہناز انجم، داود کیف، رفعت انجم، خرم خرام صدیقی، نوشابہ نور، شمائلہ نور علشبہ نواز، مبشر ستی، خالد محمود اور دیگر اہلِ علم و ادب نے شرکت کی۔

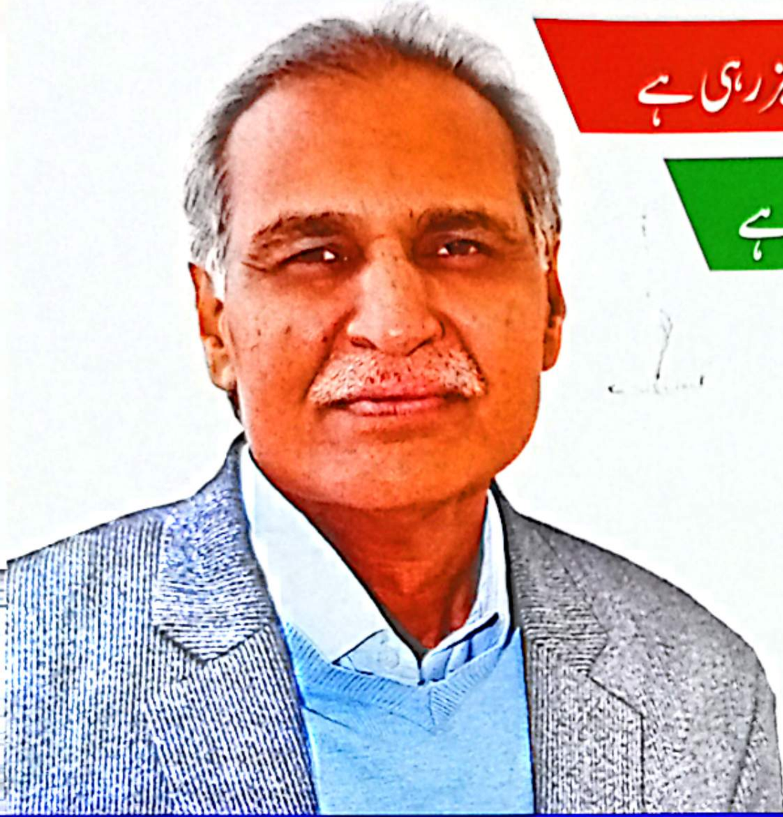

ادبی حوالہ سے فیصل آباد کی مٹی ہمیشہ بہت زرخیز رہی ہے

میرا ادبی میلان قطعاً کوئی حادثاتی معاملہ نہیں ہے

ممتاز شاعر، سفرنامہ نگار، افسانہ نویس، صحافی اور سماجی رہنما

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

سے مدیر ارژنگ **حسن عباسی** کا مکالمہ

سفرنامے کی صورت میں تخلیقی بیان حسی اعتبار سے میرے لیے بہت طمانیت کا باعث بنتا ہے

لائل پور (فیصل آباد) کی زرخیز سرزمین نے جن اہلِ قلم کو جنم دیا، ان میں ڈاکٹر جعفر حسن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار، صحافی اور سماجی راہنما ہیں۔ تعلیم کے سفر میں انہوں نے ٹاٹ اسکول سے ابتدا کی اور ٹیکنیکل ہائی اسکول، میونسپل ڈگری کالج پنجاب یونیورسٹی جیسے معتبر اداروں سے علم حاصل کیا۔ یہ جستجو انہیں بین الاقوامی افق تک لے گئی، جہاں انہوں نے اوپن انٹرنیشنل یونیورسٹی (کولمبو) سے فزیکل میڈیسن اینڈ ریہیبلیٹیشن میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے علم و تحقیق کے میدان میں اپنی شناخت مزید مستحکم کی۔

ادبی دنیا میں ان کا شمار ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جن کی تخلیقات نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر بھی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی متعدد کتب مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ملک کی جامعات میں ان کے ادبی کام پر 13 تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ''میں نے نشہ چھوڑ دیا''، ''علم المنشیات''، ''سحر قریب ہے''، ''نئے دنوں کے خواب''، ''دریا سے صحرا تک''، ''اپنے استنبول میں''، ''کیسپر کے دیس میں''، ''تنہا رہنا سکھ لیا ہے''، ''ریزہ''، ''اے ارضِ لبنان'' اور ''ساحل سے ساحل تک'' جیسی تصانیف ان کے فکری تنوع اور تخلیقی وسعت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

وہ ''حرفِ جعفر'' میگزین کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں ایک فعال کردار ادا کر رہے ہیں، جبکہ گزشتہ چار دہائیوں سے نوجوان نسل کی فکری، ادبی اور سماجی تربیت میں مصروفِ عمل ہیں۔ مباحثوں، مکالموں، مشاعروں اور ادبی نشستوں کے ذریعے انہوں نے لاکھوں نوجوانوں کے اذہان کو جلا بخشی اور انہیں مثبت سمت عطا کی۔ سماجی خدمات کے میدان میں بھی ان کا کردار مثالی ہے۔ انسانی حقوق، بچوں کے حقوق، قیدیوں کی فلاح، انسدادِ منشیات، اور ماں و بچے کی صحت جیسے حساس موضوعات پر ان کی خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں۔ قدرتی آفات—— خصوصاً زلزلہ، سیلاب 2010 اور عالمی وبا کورونا—— کے دوران ان کی عملی جدوجہد انسانیت سے ان کی وابستگی کا واضح ثبوت ہے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

بار ایسوسی ایشن چیچہ وطنی کے زیرِ اہتمام

سالانہ مشاعرہ

صدارت: عباس تابش

مہمانانِ خصوصی: عامر بن علی، حنیف صوفی

کوآرڈی نیٹر: بدر سیماب

نظامت: ہمایوں آفتاب میو ایڈووکیٹ

ہمایوں آفتاب — خرم آفاق — اسد عباس اسد — گوہر وریاہ — عدنان آصف بھٹہ — عامر بن علی — حنیف صوفی — بدر سیماب

سامعین کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی جن میں غالب اکثریت وکلاء کی تھی

سٹیج کے مناظر

مشاعرے سے قبل شعراء کرام کی بدر سیماب کے کاشانے پر حاضری

براہ راست منگوانے
کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com

CamScanner